Registered No. L. 4186

جمادی الاُخریٰ ۱۳۵۷ھ　　　　جلد ۱۲ — عدد ۶

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے　　　　قیمت فی پرچہ ۸ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن مفت

بکثرت حضرات ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ رسالہ ترجمان القرآن انکی کم استطاعتی کو ملحوظ رکھکر مفت یا رعائتی قیمت پر دیا جائے۔ اب تک ہم نے محض اپنے مقاصد کی خاطر بہت سے لوگوں کیساتھ رعائت کی اور بہت سوں کو مفت بھی دیا۔ مگر ہماری مالی حالت اب مزید رعائت کی متحمل نہیں ہے، اور ہمارے مقاصد سے ہمدردی رکھنے والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ اس کام میں کسی نہ کسی حد تک ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ لہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ۔

"جو صاحب ہم کو پورا سالانہ چندہ دینے والے ۵ خریدار مہیا کرینگے اُن کو ایک سال تک رسالہ مفت دیا جائیگا۔ اور جب تک انکے فراہم کیے ہوئے خریداروں کی تعداد پانچ رہیگی اس وقت تک پرچہ برابر مفت دیا جاتا رہیگا۔"

جو لوگ اس شرط کو پورا کرنے سے معذور ہوں۔ انکی درخواستوں پر ہم توجہ کرنے سے معذور ہیں۔

منیجر

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عنہ ۱۰	ععہ ۲۵	للعہ ۴۵	لعہ ۱۰۰
نصف صفحہ	ـے ۶	عہ ۱۵	ععہ ۲۵	للعہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ ۴	عنہ ۱۰	معہ ۱۷	ععہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرستِ مضامین

ماہ جمادی الاخری ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۸ء۔ جلد ۱۲۔ عدد ۶

اشارات ۔	ابوالاعلیٰ مودودی	۴۰۲
مقالات :-		
اختلافی مسائل اور اُن کا نقطۂ عدل	از افادات حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ	۴۱۷
وارد ھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان	منقول از طلوع اسلام دہلی	۴۲۵
معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی	۴۴۷
رسائل و مسائل :-		
نماز میں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال	ابوالاعلیٰ مودودی	۴۶۰
خطباتِ جمعہ :-		
خطبہ ۲۸ جمادی الاخری ۱۳۵۷ھ	ابوالاعلیٰ مودودی	۴۷۲
مطبوعات ۔	ادارہ	۴۸۰

باہتمام چودھری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر و پبلشر گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں

طبع ہو کر دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی صحبت میں مجبوراً اس بحث کا سلسلہ روک دینا پڑا تھا جو آغاز سال سے مسلسل چل رہی تھی۔ ربطِ کلام کی خاطر، براہِ کرم ماہ ربیع الثانی کے اشارات پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیجئے۔

اب تک ہم نے صرف یہ ثابت کیا ہے کہ اس وقت داخلی مقاومت یا مزاحمانہ تعاون کا طریقہ اختیار کر کے مسلمان کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن یہ حقیقت کا محض سلبی پہلو ہے۔ اس کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ قومیت اور جمہوریت کے اصول جب تک بدل نہ جائیں، تعاون کی پالیسی اختیار کر کے بہرحال ہم نقصان ہی اٹھائیں گے، خواہ مقاومت کے ارادے سے تعاون کریں یا معاونت کے ارادے سے ——— یہ وہ مقام ہے جہاں اچھے خاصے دیدہ ور لوگوں کو بھی دن کی روشنی میں خندق کے کنارے نظر نہیں آتے، اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ ہم روشنی ڈال کر دکھائیں گے کہ سطح پر جو ہری ہری گھاس نظر آرہی ہے اس کے نیچے کتنی بڑی اور کتنی گہری خندق چھپی ہوئی ہے۔

جہاں تک نظریات اور مقاصد کا تعلق ہے ہندو مہاسبھا اور کانگریس میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں وطنی قومیت کی علمبردار ہیں۔ دونوں اس ملک میں "فرقوں" (قوموں) کے امتیازی وجود کو

تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ دونوں علیٰحدگی پسندی (Separatist tendency.) کے ہر رجحان کی دشمن ہیں حتی کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمان کے جداگانہ مفاد کا نام سننے کی روادار نہیں۔ دونوں اس ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کر کے یہاں ٹھیٹھ جمہوریت کے اصول (ہر استثناء سے پاک کر کے) رائج کرنا چاہتی ہیں۔ دونوں کی خواہش یہ ہے کہ یہاں زندگی کے تمام معاملات خالص اور مجرد اکثریت سے طے ہوں۔ اور دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت، زبان و ادب، جذبات وحسیات، غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ قومیت اور جمہوریت کے متعلق کانگریسی لیڈروں اور مہا سبھائی لیڈروں کے نظریات میں الفاظ اور اصطلاحات کے سوا قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ جہاں مونجے "ہندو" کا لفظ بولتے ہیں وہاں جواہر لال "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مگر معنیً دونوں ایک ہیں۔

اس اتحاد کے ساتھ سیاسی پالیسی میں بھی دونوں متفق ہیں۔ کچھ مدت پہلے دونوں میں بظاہر اختلاف تھا۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین آزادی کامل ہے اور وہ انقلابی جدوجہد سے انگریزی امپیریلزم کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ بخلاف اس کے ہندو مہا سبھا یہ کہتی تھی کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہونے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائے گا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیر سایہ جمہوریت کے اصولوں پر حکومت خود اختیاری حاصل کی جائے، یعنی انگریز کی فوجی طاقت مسلمانوں کو دبانے کے لئے اس وقت تک موجود رہے جب تک کہ ہندو اس ملک کے تمام انتظامی اختیارات پر قابض ہو کر معاشی دباؤ اور تعلیمی انقلاب کے ذریعہ سے مسلمان کی قومیت کو ہندی قومیت میں تحلیل کر دینے پر قادر نہ ہو جائے۔ مہا سبھا کی رائے میں آزادی کامل کا نام اس عمل کی تکمیل کے بعد ہی لیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

——— چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہا سبھا میں یہ اختلاف قائم رہا۔ مگر ظاہری اختلاف

بھی دور ہو چکا ہے۔ مہاسبھا کی طرح کانگریس بھی اپنی نمائشی انقلابیت کو چھوڑ کر کھلم کھلا دستوری ارتقار کی پالیسی پر اتر آئی ہے اور دونوں بالاتفاق امپیریلسٹ اسٹیٹ کے تحت ناظم (Administrator.) کے فرائض انجام دے رہی ہیں

اب اگر ان دونوں میں کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہاسبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہاسبھا صحیح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہو سکتا، نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے، نہ مسلمانوں میں جا کر اس کانٹیکٹ کر سکتی ہے، نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کر سکتی ہے، نہ کہیں خالص ہندو وزارت قائم کر کے یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ "یہ قومی وزارت" ہے، نہ وار دھا اسکیم اور ودیامندر اسکیم بنا کر مسلمانوں پر انہیں مسلط کرنے کی جرأت کر سکتی ہے، نہ یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ ڈاکٹر مونجے اور بھائی پرمانند مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں، نہ اسلامی اکثریت کے صوبوں میں وزارت پر اپنا کنٹرول قائم کر سکتی ہے، اور نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں یہ اقتدار حاصل کر سکتی ہے کہ مسلمان وزراء کو اپنی گرفت میں جکڑ کر رکھے اور ذرا سے انحراف پر ان کی گوشمالی کر دے ——— کانگریس یہ سب کچھ کر سکتی ہے کیونکہ وہ ہندو مہاسبھا نہیں ہے بلکہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔

اس فرق کے ساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کے نقص کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی اور جو مہاسبھا کر سکتی ہے وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنے والی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقے پر قبضہ کرتی ہے، اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج کو حسبِ ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی وجہ سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر اس کی پشت کو سہارا دیتی ہے اور مسٹر ساورکر،

ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی جی یا جواہر لال نہیں ہیں۔ ایسے نازک مواقع کے لئے اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو مقدمۃ الجیش کو اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے۔ محفوظ فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

یہ صورتِ واقعہ جو میں نے بیان کی ہے اس سے کوئی باخبر آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ تاہم کچھ لوگ ہماری قوم میں ایسے بھی ہیں جن کو آزادی کی خواہش نے اندھا بنا دیا ہے اور وہ بالکل سامنے کی چیزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے، اس لئے میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایسی صریح شہادتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو حقیقتِ حال کو زیادہ سے زیادہ منقح کر دیتی ہیں۔

کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ آزادی کامل چاہتی ہے۔ مگر اول تو ایک مدت تک آزادی کامل کی تفسیر کرنے سے احتراز کیا جاتا رہا، اور آخر میں اس کی تفسیر کی گئی تو یہ کہ ہندوستان آزاد قوموں کے اُس وفاق میں شامل ہو جائے جو عبارت ہے برٹش کامن ویلتھ (دولت مشترکۂ برطانیہ) سے۔ چنانچہ ۳۸ء کی ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوباش چندر بوس فرماتے ہیں:۔

> "برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے، یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا . . . . . برطانیہ عظمیٰ کے لئے اپنے نظامِ سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرے۔"

یہ الفاظ صاف طور پر کانگریس کے نصب العین کو واضح کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہا پسند

کانگریسی بھی، جن کی قیادت کا شرف مسٹر بوس کو حاصل ہے، برطانوی دولت مشترکہ کے اندر "آزاد قوموں" کے اس دائرے میں جگہ پانے سے زیادہ کسی چیز کے طالب نہیں ہیں، جس کا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، اور جس کا مفاد سلطنت برطانیہ کے مفاد کے ساتھ متحد ہو جائے۔ اس مضمون پر مزید روشنی پنڈت جواہر لال کے اس بیان سے پڑتی ہے جو انھوں نے ابھی چند روز ہوئے پراگ (Prague.) میں دیا تھا اور جس پر انڈیا آفس کی طرف سے ان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا، یعنی یہ کہ

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹریبیون مورخہ ۹ اگست ۳۸ء)

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جس آزاد ہندوستان کا خواب جواہر لال اینڈ کو دیکھ رہے ہیں اس کی خارجی پالیسی کا دامن انگلستان کی خارجی پالیسی کے دامن سے بندھا رہے گا۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہندو مہاسبھا کے نصب العین اور کانگریس کے نصب العین میں کوئی فرق ہے؟۔

آزادی کامل کا جھنڈا جب بلند کیا گیا تھا، تو ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کیا گیا تھا کہ کانگریس کا مقصد انقلابی تحریک سے برطانوی امپیریلزم کے شکنجہ کو توڑ دینا ہے، اور اس کے بعد آزاد ہندوستان اپنا دستور حکومت خود بنائے گا۔ پھر جب انگریزی سلطنت نے غلام ہندوستان کے لئے دستور حکومت بنایا تو انتخابات کی جد و جہد میں یہ کہہ کر حصہ لیا گیا کہ ہم اندر سے اس دستور کو توڑیں گے۔ مگر جب انتخابات میں کامیابی حاصل ہو گئی تو دستور کو توڑنے کے بجائے اس کو چلانے کی پالیسی اختیار کی گئی، اور نئے دستور کی برکتوں کا اقرار کیا جانے لگا۔ چنانچہ پوری کانگریس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے فرمایا:۔

"چند مہینوں کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ کام کیا ہے جتنا برطانوی حکومت گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں کر سکی ہے"، (ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۳ فروری ۳۸ء)

اور مسٹر سوبھاش چندر بوس نے ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:۔

"کانگریس محض باہر سے تخریبی طریق کار ہی پر اعتقاد نہیں رکھتی، بلکہ وہ اندر رہ کر تعمیری طریق کار اختیار کرنے کو انسب سمجھتی ہے"۔ (ٹریبیون مورخہ ۱۵ جون ۳۸ء)

اس طرح ۳۶ء کی نمائشی انقلابیت ۳۸ء تک پہنچتے پہنچتے دستوری ارتقائیت میں تبدیل ہوگئی۔ سلطنت برطانیہ کے بنائے ہوئے دستور کی تمام حدود و قیود کو قبول کر کے نہایت محنت کے ساتھ انتظامی خدمات انجام دی جانے لگیں، اور ہمارے انقلابی دوستوں کو یہ یاد بھی نہ رہا کہ وہ امپیریلزم کو مٹانے کا دعویٰ لے کر اٹھے تھے۔ خود ایک کانگریسی لیڈر، مسٹر ایم این رائے، اس تغیر کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنے کے بعد خصوصاً وزارتیں قبول کرنے کے بعد کانگریسی سیاست تیزی کے ساتھ دستوریت (Constitutionalism.) کی طرف ترقی معکوس کر رہی ہے اور برطانوی امپیریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہوگئی ہے"۔ (ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۳۸ء)

یہاں پھر کانگریس اور مہاسبھا متفق ہیں۔ مہاسبھا بھی یہی چاہتی ہے کہ جدید دستور جو اقتدار بھی دیتا ہے اسے لے کر پوری طرح استعمال کرو تاکہ آئندہ کے لئے "راستہ صاف کیا جا سکے"۔

وزارتیں قبول کرتے وقت یہ کہا گیا تھا کہ ہم اہلِ ملک کی حالت کو درست کریں گے، برطانوی حکومت کے ظالمانہ قوانین کو منسوخ کر دیں گے، اور لوگوں کی آزادی پر جو ناجائز پابندیاں ہیں ان کو اٹھا دیں گے۔ مگر ایک سال سے زیادہ مدت کا ریکارڈ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کانگریسی حکومتوں نے انگریزی سلطنت کے دستور جدید ہی کی نہیں بلکہ اس کے ظالمانہ قوانین تک کی پابندی پوری وفاداری کے ساتھ کی ہے، ایک موقع کے سوا جب کہ ہری پورہ کانگریس سے پہلے سوشلسٹ جماعت کا منہ بند کرنے کی ضرورت تھی، باقی تمام مواقع پر اس امر کی کوشش کی ہے کہ گورنروں سے تصادم نہ ہونے پائے، اور باشندگانِ ہند

کو فائدہ پہنچانے کی اُن تمام صورتوں سے اجتناب کیا ہے جنہیں عمل میں لانے کے لئے آئینِ جدید کی پابندیوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کانگریسی حکومتوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جس کے لئے وہ پرانی ظالمانہ حکومت کو مطعون کرتی تھی۔

سب سے زیادہ جس چیز کا شور بلند کیا گیا تھا وہ یہ تھی کہ کانگریس ہندوستانی عوام کے افلاس کا مداوا کرنا چاہتی ہے اور اس کا اولین کام کسانوں اور مزدوروں کی خستہ حالی کا انتظام کرنا ہے۔ مگر اس کے لئے عملاً کیا کیا گیا؟ صرف چند مثالوں سے حقیقت ظاہر ہوئی جاتی ہے۔

اب سے دو سال پہلے یوپی کی کانگریس کمیٹی نے مطالبہ کیا تھا کہ شرح مالگذاری میں ۵۰ فی صدی کی تخفیف کی جائے۔ مگر جب خود کانگریس نے وزارت سنبھالی تو صاف کہدیا گیا کہ سابقہ حکومت مالگذاری میں جتنی تخفیف کر چکی ہے اس سے زیادہ تخفیف ممکن نہیں (نیشنل کال مورخہ ۳۱ جولائی ۳۸ء) اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اُس امپیریلسٹ حکومت کے مفاد کے خلاف ہے جس کی وفادارانہ خدمت انجام دینے کے لئے یہ حضرات ایوانِ وزارت میں تشریف لے گئے ہیں۔

کسانوں کے بعد مزدوروں کو لیجئے۔ احمد آباد، شولا پور، اور کانپور میں کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے، کیا کوئی صداقت پسند آدمی یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ وہ پرانی ظالمانہ حکومت کے برتاؤ سے کچھ بھی مختلف ہے؟ اس پر مزید یہ کہ غریب مزدور اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لئے اگر ہڑتال یا ستیا گرہ یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جنھوں نے خود یہ تمام ہتھیار انگریزی حکومت کے خلاف استعمال کئے تھے، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور بلا تکلف فرماتے ہیں کہ "کار خانہ دار ان کے خلاف پولیس کی امداد طلب کرنے میں، اور کانگریسی حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہوگی،، (ہریجن مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء)

یہ بھی کہا گیا تھا کہ کانگریس اُن ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرائے گی جو انگریزی حکومت نے نافذ کئے تھے اور باشندگانِ ہند کو ان کے کھوئے ہوئے مدنی حقوق (Civil liberties.) واپس دلائے گی۔ مگر واقعات کیا ہیں؟ وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کئے تھے۔ اور وہ صرف موجود ہی نہیں ہیں بلکہ کانگریسی حکومت آزادی کے ساتھ ان کو استعمال کر رہی ہے اور بالکل انہی دلائل کے ساتھ ان کے استعمال کو حق بجانب قرار دے رہی ہے، جو کسی زمانہ میں انگریز حکام پیش کیا کرتے تھے۔

وہی کانگریسی جو کہتے تھے کہ بغاوت ہمارا مذہب ہے، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ چلاتے ہیں، اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر باپٹ اور مسٹر جگناتھ پرشاد ورما کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

ایک طرف سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے شور مچایا جاتا ہے اور دوسری طرف شولاپور میں "یوم استقلال" کے موقع پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے، اور ان میں سے ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سزا کے خلاف کسی زمانہ میں ہنگامۂ قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔

سیاسی ایجی ٹیشن کے مواقع پر دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے تھا۔ کانپور، چراله، اور دھراوی کے واقعات کافی مشہور ہو چکے ہیں۔

کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ، جس کے خلاف کانگریس ہی نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں ہی بے تکلف اس کو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کے لئے اسے استعمال کیا گیا، اور مدراس میں ہندی زبان کو ناراض باشندوں پر زبردستی مسلط کرنے کے لئے آج کل آئے دن اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔

وہی سی آئی ڈی جس کی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا، آج کانگریسی حکومتیں اپنے

سیاسی مخالفین کے خلاف اس سے پوری آزادی کے ساتھ کام لے رہی ہیں، اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے تو سی آئی ڈی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ وہی پریس کی آزادی جس کو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جا رہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں۔ نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں، اور اڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پوری اختیارات عطا کئے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کر دے۔

(تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا۔ یکم نومبر ۳۷ء۔ ٹریبیون کا مقالہ افتتاحیہ۔ مورخہ ۷ اگست ۳۸ء۔ اور اخبار سرونٹ آف انڈیا مورخہ ۱۴ جولائی ۳۸ء)

کانگریسیوں سے دریافت کیجیے کہ گذشتہ ۱۳ مہینوں میں تم نے ملک کی حقیقی فلاح و بہبود کے لئے کیا کیا، تو وہ دو چار نمائشی کاموں کے سوا اپنے کسی ایک کارنامے کا بھی حوالہ نہیں دے سکتے۔ ان کے پورے نامۂ اعمال کا خلاصہ مسٹر ایم این رائے کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

> "کانگریسی وزیروں نے امپیریلسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ جو جنگی مورچے (Strategic positions.) ان کے قابو میں آئے ان کو بھی غنیم پر حملہ کرنے کے لئے انھوں نے استعمال نہیں کیا۔ وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی رضا سو بلکہ اس کی ہدایت کے تحت اسی امپیریلسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کر کے وہ گئے تھے۔"

ایمانداری کا تقاضا ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکی ہیں، اور نہ موجودہ دستور کی حد میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکیں گی" (نیشنل کال۔ مورخہ ۱۳ جولائی ۳۸ء)

سوال یہ ہے کہ جب حقیقت میں کانگریس نہ تو موجودہ آئین کو توڑ سکی اور نہ اس کو چلا کر ملک کی کوئی خدمت ہی کر سکی اور نہ آئندہ کسی حقیقی خدمت کے لئے اس آئین میں کوئی گنجائش ہی موجود ہے تو آخر وہ کیوں اس آئین کو چلا رہی ہے؟۔

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کریں گے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح نمایاں ہو جائیگی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اس کے سوا نہیں ہے کہ پراونشل آٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہو سکیں انہیں جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق کے لئے استعمال کیا جائے، اور اس ملک کی قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کے پراونشل آٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے، اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ باہزاراں عشوہ و ناز، آخر کار اس کے فیڈریشن والے حصہ کو بھی اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائے گا تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطے سے قابو میں لایا جا سکے۔

یہ وہ نکتہ ہے جس پر کانگریس، ہندو مہاسبھا اور برٹش گورنمنٹ کے مفاد باہم مشترک ہو گئے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ جس طرح ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لئے فلسطین میں مسلمانوں کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی، اسی طرح ہندوستان میں بھی وہ سمجھتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بھینٹ چڑھا کر ایک دوسری سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کیا جا سکے تو یہ بہت اچھا سودا ہے۔ رہی مہاسبھا، تو اس کی عین تمنا وہی ہے جس کے لئے آج کل کانگریس کوشاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ہم کانگریسی حکومتوں میں بندے ماترم گانا

مسٹر ڈیسمکھ، بابو جگت نرائن لال اور ایسے ہی بہت سے کٹے مہا سبھائیوں کو پرانے کانگریسیوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرتے دیکھتے ہیں، اور دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گورنر صاحبان کس ہوشمندی کے ساتھ کانگریسی وزارتوں سے معاملہ کر رہے ہیں: جب وہ سلطنت برطانیہ کے حِمیٰ (محفوظ چراگاہ) کی طرف بڑھتی ہیں تو یہ پوری طاقت سے باگ کھینچ لیتے ہیں، اور جب وہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کے لئے جانا چاہتی ہیں تو یہ اطمینان کے ساتھ ڈھیلی رسّی چھوڑ دیتے ہیں۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کے لئے جو خاص اختیارات گورنروں کو دیے گئے تھے ان کی غرض اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش (گاندھی جی کے بقول "شریفانہ قرارداد" Gentleman's agreement.) سے جو اُن کے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا، اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، تو اس وقت تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کرکے ان کی گوشمالی کی جا سکے۔

کانگریس اپنے اس مقدم ترین بلکہ واحد پروگرام پر کس طرح عمل کر رہی ہے۔ اس کی توضیح ذیل کے واقعات سے اچھی طرح ہو جائے گی:۔

(۱) دستورِ جدید کے مطابق صوبوں کی حکومتوں کو (اور فیڈریشن قبول کرنے کی صورت میں مرکزی حکومت کو بھی) چلانے کے لئے پارٹی سسٹم اختیار کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کانگریس کی اکثریت ہے، وہاں خالص کانگریسی حکومت ہو، حکمراں پارٹی اور اس کی وزارت میں کوئی مسلمان یا غیر ہندو اس وقت تک شامل نہ کیا جائے جب تک کہ وہ کانگریس کے عہدنامہ پر دستخط کرکے کانگریس پارٹی کے ڈسپلن کا تابع نہ ہو جائے اور تمام اسمبلیوں کی کانگریس پارٹیاں مرکزی کانگریس کی قیادتِ علیا (High Command.) کی تابع فرمان بن کر رہیں ـــــ اس پالیسی کو مسٹر سوباش چندر بوس نے اپنے ایک بیان میں بدیں الفاظ واضح کیا ہے:۔

"پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ، سوراج سے پہلے اور سوراج کے بعد، دونوں صورتوں میں آئندہ کے لئے ہمارا نعرہ ہوگا"

اسی پالیسی کو جناب مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریسی قیادت علیا کے وزیر مختار (Minister plenipotentiary.) کی حیثیت سے یوپی مسلم لیگ پارٹی کے سامنے بدیں صورت پیش فرمایا تھا کہ وہ ایک مستقل پارٹی کی حیثیت سے اپنے آپ کو فنا کرکے کانگریس پارٹی میں ضم ہو جائے، ورکنگ کمیٹی کی ہدایات اور پارٹی ڈسپلن کی پابندی قبول کرے اور آئندہ کے لئے عہد کرے کہ انتخابات میں اپنے علحدہ امیدوار کھڑے نہ کرے گی۔

ہندو اکثریت کی پارٹی میں اس طرح ضم ہو جانے اور اس کی ڈکٹیٹر شپ کو قبول کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ مسلمان خود ہی برضا و رغبت ہندو راج کو قبول کرلیں، قبل اس کے کہ وہ پوری طرح ان پر بجبر مسلط ہو۔ عملاً اس ڈکٹیٹر شپ کا نتیجہ یہ ہے کہ جو مسلمان "بعض صوبوں کی وزارتوں میں لئے گئے ہیں وہ نہ مسلمانوں کے نمائندے ہیں، نہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وزارت میں لئے گئے ہیں، اور نہ کانگریس ہائی کمانڈ کی پالیسی کے خلاف وہ کوئی حرکت کرسکتے ہیں۔ کانگریس کے تحت مسلمان وزراء اور ہندو وزراء کی حیثیت میں جس قدر بیّن فرق ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک سی پی کی مثال کافی ہے۔ مسٹر شریف، سابق کانگریسی وزیر نے جب ایک مسلمان مجرم کو اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کیا تو کانگریس ہائی کمانڈ نے فوراً ان سے باز پرس کی، اور انہیں وزارت سے الگ کر دیا، درانحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ مسٹر شریف نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا ہے، نہ کسی قسم کی بددیانتی کی ہے، اور نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "مدینہ" مورخہ ۲۵ جون ۱۹۳۸ء)۔ اس کے برعکس ابھی تھوڑے ہی دن کا واقعہ ہے کہ پنڈت شکلا کی نئی وزارت نے برسر اقتدار آتے ہی پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ فسادات جبل پور کے ہندو ملزموں کو رہا کر دیا جن پر قتل،

لوٹ مار اور آتش زنی کے سنگین الزامات تھے، مگر اس پر کانگریس ہائی کمانڈ نے کسی باز پرس اور کسی تحقیقات کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ (ملاحظہ ہو "مدینہ" مورخہ ۱۲ اگست ۳۸ء) پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، غبن اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرتی کرنے کے الزامات عائد کیے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہہ کر رفع دفع کر دیا تھا کہ:۔

> "کانگریس بہرحال معمولی انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں، دونوں میں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جس کی وہ نمائندگی کر رہی ہیں" (ٹریبیون مورخہ ۱۹ جون ۳۸ء)

---

(۲) پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جداگانہ انتخاب ہے کیونکہ اس کی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر علیحدہ بلند ہو سکتی ہے، اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہابھارتیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔ مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنامی کو دور کرنے کے لئے بار بار پیش کیا جاتا تھا، مگر انگریز ابھی اُس "شریفانہ قرارداد" پر پوری طرح اعتماد کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو اس کے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی، اس لئے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنے مفاد کی خاطر اس نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔ اس میں ناکام ہونے کے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب لگائی جائے، یعنی کانگریس براہ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں جا کر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے اور ایسے مسلمانوں کو اُن سے منتخب کرالائے، جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹر شپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، ہائی کمانڈ کے غلام بن کر رہیں، جس طرح ہائی کمانڈ انہیں اٹھائے اس طرح اٹھیں اور جس طرح بٹھائے اس طرح بیٹھیں، جس قسم کے قوانین کانگریس کی ہندو اکثریت پاس کرنا چاہتی ہیں

مسلمانوں کی طرف سے بے چون وچرا منظور کرلیں اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لئے جو جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی خدمت مہاتما جی یا پنڈت صاحب نہیں بلکہ کوئی خان صاحب اور کوئی سید صاحب انجام دیں ـــــ اسی چیز کا نام مسلم ماس کانٹیکٹ ہے۔

اس کے مہلک نتائج پر میں پچھلے صفحات میں کافی بحث کرچکا ہوں، مگر یہاں اس کے ایک اور خطرناک نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مسلم اکثریت کے صوبوں میں یہ تحریک کامیاب ہوجائے تو جہاں مسلمان پراونشل آٹانومی سے فائدہ اٹھاکر کسی حد تک اپنی خود مختارانہ حکومت چلاسکتے ہیں، وہاں بھی وہ اس کے فائدے سے محروم ہوجائیں گے۔ ان صوبوں کی حکومتیں بھی کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوجائیں گی، وہاں بھی وہی پالیسی نافذ ہوگی جو کانگریس کی ہندو اکثریت نافذ کرانا چاہے گی، اور وہاں کے وزراء کی بھی اسی طرح بات بات پر گوشمالی کی جاسکے گی جس طرح سی پی کے مسلمان وزیر کی کی گئی۔ یہ گویا فڈریشن سے پہلے فڈریشن کا قیام ہوگا، اور اس فڈریشن میں مرکز کا اقتدار برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بھی زیادہ سخت اور ہمہ گیر ہوگا ـــــ صوبۂ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کے لئے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ۹۵ فی صدی مسلمان اکثریت ہے، وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں جو تعلیمی پالیسی گاندھی جی نے تجویز فرمائی ہے اسے سمجھنے اور سرحدی پٹھانوں میں نافذ کرنے کے لئے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور واردھا بھیجے جاتے ہیں (نیشنل کال مورخہ ۲۸ جون ۳۸ء و ٹریبون مورخہ ۲۲ جولائی ۳۸ء) سرحد کا وزیر اعظم ہندوؤں کو خوش کرنے

کے لئے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈریں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائیں گی ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پاکر ملازمت پر بحال کر دیا جاتا ہے تو ہندو مہاسبھا شور محشر برپا کر دیتی ہے، کانگریس ہائی کمانڈ اس کی بازپرس کے لئے سرحد کے وزیر اعظم کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے، اور اس جرم عظیم کی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر کر دیا جاتا ہے ——— اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے پراونشل آٹانومی عملاً بے معنی ہو جائے، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں بھی اقلیت کی طرح بے بس ہو کر رہ جائیں، اور تمام ہندوستان پر انگریز کے زیر سایہ کانگریس کی ہندو اکثریت حکمرانی کرے۔ یہ برکت ہے مسلم ماس کانٹیکٹ کی۔ (باقی)

حسب اعلان آئندہ پرچہ میں وہ تمام مضامین جو شعبان ۵۶ھ سے اب تک سیاسیات پر لکھے گئے ہیں نئی ترتیب کے ساتھ یکجا شائع کئے جائیں گے اور اس سلسلہ کی تکمیل بھی اسی پرچے میں ہوگی۔

مقالات

اختلافی مسائل اور ان کا نقطۂ عدل

(۳)

از افاداتِ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

چند مسائل اور ہیں جن کی اصلیت کے بارے میں ایک عام اور عجیب غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے، اور درحقیقت یہی غلط فہمی موجودہ اختلافات کا سرچشمہ ہے۔ ہم انہیں یہاں مجملاً بیان کرنا چاہتے ہیں:۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی وہ تمام تفریعات جو ان لمبی لمبی شرحوں اور فتاوے کی موٹی موٹی کتابوں میں موجود ہیں، سب کی سب امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے اقوال ہیں۔ وہ ان اقوال میں تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول ان ائمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتووں کو سامنے رکھکر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے۔ اور یہ جو ان کتابوں میں "علی تخریج الکرخی کذا"، اور "علی تخریج الطحاوی کذا"، کے الفاظ آیا کرتے ہیں ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح "قال ابو حنیفۃ کذا" (امام ابوحنیفہ نے یوں فرمایا ہے) اور "جواب المسئلۃ علی مذہب ابی حنیفۃ کذا" (امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں ہے) کے درمیان وہ کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے۔ اور ابن الہمام و ابن نجیم وغیرہ محققینِ حنفیہ کا مسئلۂ دہ در دہ اور مسئلہ شرط تیمم[1] اور ایسے دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ "دراصل یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں"، ان کے نزدیک بالکل ناقابل اعتنا ہے۔ اسی طرح بعض ارباب علم و مشیخت اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مذہب حنفی کی بنا انہی جدلی بحثوں پر

[1] حنفیہ کے یہاں تیمم کی اجازت بس وقت مل سکتی ہے جبکہ آدمی پانی سے ایک میل دور ہو۔

قائم ہے جو المبسوط، الہدایہ اور التبیین کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے مذہب کی بنا ان بحثوں پر نہیں ہے، بلکہ اس طریق بحث وجدل کے بانی دراصل معتزلہ ہیں، جسے متاخرین نے اس خیال سے اختیار کر لیا تھا کہ اس سے طلبہ کے ذہن میں تیزی اور وسعت پیدا ہوگی، اگرچہ ان کی تمنا بار آور نہ ہوئی اور ان کے اس طرز عمل نے دماغوں کو جلا اور وسعت دینے کے بجائے انہیں بے بصیرتی اور تعصب کی تنگنائیوں میں گھیر کرنا کارہ بنا دیا۔

ہم اس جگہ ان اوہام اور شکوک کی تردید میں لمبی گفتگو نہیں کرنی چاہتے، کیونکہ اس باب کی تمہید میں جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی روشنی ان میں سے اکثر کا خود بخود ازالہ کر دیتی ہے۔

(۲) بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کی اساس وہ اصول ہیں جو اصول بزدوی وغیرہ کتابوں میں درج ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر اصول ایسے ہیں جن کا ذکر ان بزرگوں نے کبھی نہیں کیا، بلکہ وہ ان کے اقوال وفتاوی کو سامنے رکھ کر بعد میں وضع کئے گئے ہیں۔ مثلاً میرے نزدیک فقہ کے حسب ذیل اصول ائمہ کے کلام سے بعد والوں نے نکالے ہیں اور امام ابو حنیفہ یا صاحبین سے کوئی صحیح روایت ایسی منقول نہیں جس میں یہ اصول مذکور ہوں۔

"خاص اپنے حکم میں خود واضح اور مبیّن ہے، اس کے ساتھ کوئی تشریحی بیان ملحق نہ کیا جائے گا۔"

"کسی حکم پر اضافہ اس حکم کا نسخ ہے۔"

"خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے۔"

"کثرتِ رواۃ لازمۂ ترجیح نہیں۔"

"غیر فقیہ راوی کی روایت اگر اصول وقیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں۔"

"مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کوئی اعتبار نہیں۔"

اس قسم کے بہت سے اصول فقہیہ ایسے ہیں جن کی تعیین وتفریع سے ائمہ کو کوئی تعلق نہیں، اور ایسے

اصولوں کی محافظت کرنا اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کو بڑے تکلفات کے ساتھ دفع کرنا، متقدمین کا طریقہ نہ تھا۔ ان کی محافظت و مدافعت ہماری توجہ کی صرف اسی قدر مستحق ہے جس قدر ان کے خلاف اصول و قواعد فقہ کی۔ اگر ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے میں تکلف سے کام لیا جائے جیسا کہ عام لوگوں کا شیوہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اصول کو اس جوشِ حمایت سے محروم رکھا جائے۔

اب ہم چند مثالیں دیکر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ان حضرات نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ "لفظ خاص اپنے حکم میں خود واضح ہے۔ کسی تشریحی بیان کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے گا"۔ یہ قاعدہ دراصل متقدمین کے اس فعل سے نکالا گیا ہے کہ انھوں نے آیت وَاسْجُدُوْا وَارْكَعُوْا کی بنا پر نماز میں صرف رکوع و سجود کو فرض قرار دیا اور اطمینان کو فرض نہیں ٹھہرایا درآنحالیکہ حدیث میں یہ ارشاد موجود تھا کہ "آدمی کی نماز نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو پوری طرح ٹھہرائے نہیں"۔ اس ایک معاملہ میں متقدمین نے جو مسلک اختیار کیا، متاخرین نے اس سے ایک قاعدۂ کلیہ وضع کر لیا۔ مگر دیکھو کہ متعدد معاملات میں وہ خود اپنے مقرر کئے ہوئے اس قاعدے کو کس طرح توڑتے ہیں:۔

آیت وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ میں محض سر پر مسح کرنے کا حکم ہے۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے "وَامْسَحُوْا" کا لفظ خاص ہے، قاعدۂ مذکور کی رو سے چاہئے تھا کہ سر کے مسح کی مطلق فرضیت کا فتویٰ دیا جاتا، لیکن حنفیہ یہاں اپنے اس قاعدہ کی پابندی نہیں کرتے اور اس حدیث کی بنا پر جس میں مذکور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناصیہ کا مسح فرمایا، مسح کے لئے سر کے چوتھائی حصہ کی حد مقرر کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں حکم خاص کے ساتھ اس کی تشریح کو کیوں ملحق کیا گیا؟

قرآن کا حکم ہے اور لفظ خاص کے ساتھ ہے کہ "زانی اور زانیہ کو کوڑے مارو"۔ مذکورۂ بالا

قاعدہ کا اقتضا تھا کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب کو کوڑے ہی مارنے کی سزا دی جاتی۔ مگر یہی احناف حدیثوں کو اس آیت کا بیان مانتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو تو کوڑے مارے جائیں، لیکن شادی شدہ مجرم کو سنگسار کیا جائے۔ کیا یہ لفظ خاص کے ساتھ تشریح کا الحاق نہیں؟

آیت اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا میں مطلقاً چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ قاعدۂ مذکور کے مطابق چاہئے تھا کہ ایک پیسہ کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا لیکن اپنے مقرر کئے ہوئے اصول کو بالائے طاق رکھ کر انہی حضرات نے دس درہم کی شرط لگائی اور حدیث کو آیت کا بیان قرار دیا۔

طلاقِ مغلظ دینے کے بعد شوہر اگر از سر نو مطلقہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہے تو قرآن حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ، کے الفاظ کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کے طلاق دینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کر چکا ہو۔ اس حکم کا لفظ یعنی "تَنْکِحَ" خاص ہے جو اپنے متعارف مفہوم میں ایجاب قبول تک محدود ہے۔ پس آیت سے صرف اتنی شرط نکلتی ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح یعنی ایجاب و قبول کرے۔ لیکن فقہائے احناف نے حدیث "حتی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتك" کو اس حکم کا بیان تسلیم کر کے نکاح کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ دوسرا شوہر اس عورت سے جماع بھی کرے۔

بتاؤ ان مثالوں میں اصول الخاص مبیّن لا یلحقہ البیان کا کتنا لحاظ کیا گیا ہے؟

(ب) قرأت نماز کے متعلق نص قرآنی "فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ"، میں "مَا تَیَسَّرَ" کا عموم چاہتا ہے کہ جتنا بھی اور جہاں سے بھی قرآن پڑھ لیا گیا نماز ہو جائے گی۔ اور حدیث "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کا ظاہری مفہوم چاہتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ہر رکعت میں فرض ہے۔ لیکن قدماء نے آیت کے عموم کو اپنی جگہ رکھا اور حدیث کو اس کا مخصص نہ مانتے ہوئے فتویٰ دیا

کہ قرأتِ فاتحہ فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کے بعض اور اقوال سے متاخرین نے ایک کلی اصول یہ مستنبط کرلیا کہ "العام قطعی کالخاص" یعنی لفظ عام بھی اپنے حکم اور مفہوم میں خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے۔ اس کا عموم تخصیص کا متحمل نہیں بلکہ وہ ایک مستقل حکم ہوتا ہے۔

اس اصول کا تقاضا تھا کہ آیت "فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" کے عموم کو بھی قطعی مان کر کہا جاتا کہ ہر چھوٹی بڑی ھدی جو بھی بآسانی میسر آسکے قربانی کے کام آسکتی ہے، کیونکہ "فَمَا اسْتَيْسَرَ" کا لفظ عام ہے اس لئے اس کے مدلول اور مقصود میں بھی عموم اور وسعت کو باقی رکھنا چاہئے۔ لیکن احناف حدیث سے خود ہی تخصیص فرماتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ھدی کے لئے بکرا یا بکرے سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہئے۔ کیا یہاں لفظ عام کی قطعیت خاص کی طرح قائم رہی؟

(س) اصول فقہ کی ایک محکم دفعہ یہ بھی ہے کہ "لا عبرة بمفهوم الشرط والوصف" یعنی اگر کوئی حکم کسی خاص موقع پر دیا گیا ہو تو اس حکم کے اطلاق میں اس خاص موقع کی خصوصیات اور شرائط کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ یہ قاعدہ دراصل سلف کے اس مسلک سے نکالا گیا ہے جو انھوں نے آیت "فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا" کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور بوجہ ناداری اس کے اخراجات کے متکفل نہیں ہوسکتے وہ لونڈی سے نکاح کرسکتے ہیں۔ لیکن متقدمین نے اس شرطِ عدم استطاعت کو قید جواز نہ مانتے ہوئے ذی استطاعت اور صاحب مقدرت انسان کو بھی لونڈی سے نکاح کی اجازت دے دی۔ ان کے اس فتویٰ سے مندرجہ بالا اصول منضبط کرلیا گیا۔

لیکن اونٹ کی زکوٰۃ کے بارے میں یہ لوگ خود اس اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ نص کے الفاظ (فی الابل السائمة زکوٰة) ہیں جن میں یہی قید شرط مذکور ہے۔ اصولِ مذکورہ کے لحاظ سے چاہئے تھا کہ سائمہ اور غیر سائمہ ہر نوع کے اونٹوں میں زکوٰۃ فرض قرار دی جاتی اور اس لفظ "السائمة"

کے مفہوم محکم کو مقید نہ کیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا اور صرف چرنے والے اونٹوں میں زکوٰۃ کی فرضیت کا فتویٰ دیا گیا۔

(د) حدیثِ مصراۃ (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے) میں ائمہ سلف نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کے پیشِ نظر متاخرین نے یہ کلی اصول بنا لیا کہ جب کوئی غیر فقیہ راوی کسی ایسی حدیث کی روایت کرے جو قیاس سے متصادم ہوتی ہو تو وہ واجب العمل نہ ہوگی۔ مگر انہیں واضعین اصول نے حدیثِ قہقہہ کو جو خلافِ قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی، واجب العمل مانا اور فتویٰ دیا کہ نماز میں آواز بلند ہنسنے سے نماز ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ وضوء اور قہقہہ کا کوئی تعلقِ معنوی اب تک دائرۂ قیاس میں نہیں آسکا۔ اسی طرح افطارِ صوم کے بارے میں بھی یہ اصول پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب کھانا پینا روزہ کو توڑ دیتے ہیں تو چاہے بھول کر کھایا جائے یا عمداً، بہر حال روزہ ٹوٹ جانا چاہئے۔ لیکن اس کھلے ہوئے قیاس کو انھوں نے ایک ایسی حدیث کی وجہ سے ترک کر دیا جو خلافِ قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی۔

صاحب نظر کے لئے یہ چند اشارات کافی ہیں، ورنہ اس کے شواہد بے شمار ہیں جو بتاتے ہیں کہ ان اصولوں کی حقیقت کیا ہے، اور خود ان کے واضعین نے کس طرح ان کی خلاف ورزی کی ہے۔ پھر جب اس خلاف ورزی پر اعتراض کیا گیا تو اس کا جواب انھوں نے جن تکلفات اور سخن پروریوں کے ساتھ دیا ہے ان کی داستان بھی ہر ناظر ان کی کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔

مسئلہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو سکتی ہے اگر تم صرف ایک ہی قاعدہ کے متعلق علماء محققین کی تصریحات دیکھ لو۔ وہ فرماتے ہیں کہ شرط فقاہت والے اصول میں دو مذہب ہیں۔ ایک تو عیسیٰ ابن ابان کا ہے جن کے نزدیک غیر فقیہ راوی کی روایت ضابط اور عادل ہونے کے باوجود خلافِ قیاس ہونے کی صورت میں نا واجب العمل ہے، اور اکثر متاخرین نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

دوسرا مذہب امام کرخی کا ہے جن کے نزدیک خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لئے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں۔ حدیث بہر حال قیاس کے مقابلہ میں واجب الاتباع ہے۔ بہت سے علماء نے اسی دوسری رائے کو مانا ہے۔ چنانچہ وہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ

"یہ قول (یعنی قول اول) ہمارے ائمہ سے منقول نہیں۔ ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ انھوں نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو واجب العمل تسلیم کیا ہے حالانکہ روایت قیاس کے خلاف تھی۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے صریحاً فرمایا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا۔"

خود ان متاخرین کا اکثر تخریجات میں مختلف ہونا اور ایک دوسرے پر اعتراض کرنا ہمارے خیال کی ایک ناقابلِ تردید شہادت ہے۔

(۳) ایک غلط فہمی اور ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقاہت کے لحاظ سے محض دو گروہ ہیں۔ ایک اہل الظاہر۔ دوسرے اہل الرائے۔ اور جو شخص بھی قیاس اور استنباط سے کام لے وہ اہل الرائے میں سے ہے۔ حاشا کہ حقیقت سے یہ انتہائی بے خبری ہے۔ لفظ "رای" کا مفہوم نہ تو نفس عقل و فہم ہے، کیونکہ کوئی عالم اس صفت سے عاری نہیں۔ نہ رائے کا مطلب وہ رائے محض ہے جس کا رشتہ سنت سے منقطع ہو، کیونکہ ایسی رائے کوئی متبع اسلام اختیار نہیں کرسکتا۔ اور نہ رائے سے مقصود قیاس و استنباط کی قدرت ہے، کیونکہ امام احمدؒ اور اسحاقؒ بلکہ امام شافعیؒ کا بھی بالاتفاق اہل الرائے میں شمار نہیں، حالانکہ وہ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں۔ رائی اور اہل الرائے کا مفہوم ان تمام سے جداگانہ ہے۔ اہل الرائے کہتے ہیں ان لوگوں کو جنھوں نے جمہور مسلمین کے متفق علیہا مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل میں کسی امام کے اقوال واصول کو سامنے رکھ کر تخریج و استنباط پر اکتفا کرلیا، اور روایات و آثار کے تتبع سے تقریباً بے نیاز ہو کر

اصول اور قیاس کی مدد سے جزئیات نکالنے لگے۔ وہ حل مسائل کے وقت نصوصِ آثار و سنن کی طرف مراجعت کرنے کے بجائے زیادہ تر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہاء کے ٹھہرائے ہوئے اصول میں سے کس اصل کے تحت آتا ہے، اس کے اشباہ و نظائر کیا ہیں، کس مسئلہ کی علت اس میں پائی جاتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں ظاہریہ وہ لوگ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثارِ صحابہ اور اقوالِ تابعین سے، جیسے امام داؤد اور ابن حزم۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنۃ کا گروہ ہے، جیسے امام احمد و امام اسحاق۔

یہ بحث اگرچہ اس تفصیل و اطناب کے ساتھ عنوانِ کتاب سے خارج تھی لیکن اس کے باوجود مذہبی فرقہ آرائیوں کی موجودہ خلفشار اور حقیقتِ حال سے عام بے خبری کو دیکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ عدل و توسط کا نقطہ جو ان ہنگاموں میں گم ہو گیا ہے، اس کو افراط و تفریط اور تعصب کی الجھنوں سے نکال کر ارباب نظر کے سامنے پیش کر دوں۔ عدل پسند اور حق طلب کے لئے یہی کافی ہے، متعصب کے لئے کچھ بھی کافی نہیں۔

وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝

سچ کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۱۹۳۵ء سے ۱۷x۲۷ کے ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر مہینہ کی یکم - گیارہ اور اکیس کو شائع ہوتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ صاحب ذوق حضرات جو مولٰنا عبدالماجد صاحب دریابادی کے طرز انشاء کے عاشق ہیں اور آپ کے مخصوص و دلنشین طرز صحافت کیلئے آپکے اخبار سچ کے بند ہونے کے بعد سے بیتاب تھے۔ اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے۔ لہٰذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی للعہ چار روپیہ جلد روانہ فرما کر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچہ دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑے گا۔

"صدق" ہر اعتبار سے سچ سے بڑھا ہوا ہے۔ معنوی حیثیت سے مضامین قرآنی کا اضافہ۔

سالانہ چندہ (للعہ) ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۴۳ ہیوٹ روڈ لکھنؤ

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

ایک عظیم الشان خطرہ سے آگاہی

(منقول از رسالہ طلوع اسلام - دہلی)

[ہندوستان میں انگریزی امپیریلزم نے اپنے قدم جمانے کے لئے جس چیز کو سب سے زیادہ اہم سمجھا تھا وہ ایک ایسی تعلیمی سکیم تھی جو ہندوستانیوں کو مغرب پرستی کے سانچے میں ڈھال دے۔ اس اسکیم کی تیاری کے لئے انگریزی قوم کو خود اپنے میں سے ایک میکالے تلاش کرنا پڑا۔ اب اس کے ٹھیک ایک صدی بعد ہندو امپیریلزم اپنے قدم جمانے کے لئے میدان میں آیا ہے اور اس نے بھی ایک ایسی تعلیمی اسکیم کی ضرورت محسوس کی ہے جو ہندوستان کی سب سے زیادہ انفرادیت پسند قوم یعنی مسلمانوں کو ہندی قوم پرستی کے سانچے میں ڈھال دے۔ اس کام کیلئے بھی ایک میکالے کی حاجت تھی، سو وہ میکالے ان کو خوش قسمتی سے خود ہی قوم میں سے مل گیا جس کو وہ اپنے امپیریلزم کے دام میں لانا چاہتے ہیں۔ میکالے کا مشہور ڈسپیچ ۱۸۳۵ء میں لکھا گیا تھا۔ واردھا کی تعلیمی اسکیم ۱۹۳۷ء میں تیار ہوئی ہے۔ دونوں میں صرف ۱۰۲ سال کا تفاوت ہے۔

اسی واردھا اسکیم سے ملتی جلتی مگر زیادہ خطرناک ایک اور تعلیمی سکیم بھی ہے جس کا نام "ودیا مندر اسکیم" ہے۔ ہم ان دونوں کے متعلق مواد جمع کر کے ایک مفصل مقالہ لکھنا چاہتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ناظرین کے سامنے آئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذیل کے مقالہ کو پڑھ لیں جس میں ایک صاحب بصیرت شخص نے واردھا اسکیم پر مسلمان کی نگاہ سے تبصرہ کیا ہے۔

سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہو کہ مسلمانوں کے دیندار طبقے بھی بے سمجھے بوجھے اس جال میں پھنس رہے ہیں چنانچہ بعض اکابر اہلِ علم اور مذہبی مجالس کے جو خیالات ہم کو معلوم ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ حضرات اس اسکیم کے بعض اجزا ہی کو اعتراض کی نظر سے دیکھ رہے ہیں جس کی بنیاد میں زہر بھرا ہوا ہے اس تک ان کی نگاہ نہیں پہنچی ایسی حالت میں مسلمانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے، ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اس مقالہ کو ایک مستقل پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ جو حضرات مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے اسے تقسیم کرنا چاہیں وہ ۱ر فی نسخہ یا پانچ روپیہ سیکڑہ کے حساب سے منیجر رسالہ طلوع اسلام، بلیماران دہلی سے طلب فرمائیں]

تمہید تاریخ عالم کے زمانہ قدیم پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت وسطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ وبرباد کرنے کے لئے قتل و غارتگری اور کشت وخون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں چنگیز خاں وہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں فرعون ونمرود، شدّاد وہامان کے جور واستبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کردیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا، علانیہ سبعیت وبربریت کا زمانہ تھا عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی برکتوں اور رحمتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جس میں اسے انسانیت تڑپتی، بلکتی، پھڑکتی نظر آئے۔ لیکن جو لوگ حقائق اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اُن پر یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہد جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہی، فرق صرف اتنا ہی کہ وہ عہد جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح وبہبود کے خوش آئند نقاب اڑھائے، وہ جو کچھ کرتا تھا، کھلم کھلا کرتا تھا، بتاکر، جتاکر، دکھاکر کرتا تھا لیکن آج انسان عقل وحکمت میں بہت ترقی کرچکا ہے۔ آج اس طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ

مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک کہیں نظر نہ پڑے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے، در یں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جاہلیت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفان بلاخیز ہیں جو کف بر دہاں بڑھتا، امنڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں، اور جس کی شور انگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پُرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس میں نہ شور ہے نہ تموج، لیکن سطح آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک گرمچھ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں اس طرح کہ نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سن سکیں۔ اس پُرسکوت طریقِ تخریب اور اس آتش خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں، نہایت خاموشی سے اس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجئے۔ وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی اور اسے پتہ اس وقت چلے گا جب وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہو گی۔ حضرت اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!!

انگریزوں کا طرزِ عمل جب ہندوستان میں انگریزوں کے پاؤں جمنے شروع ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے مسئلۂ تعلیم ہی کو لیا۔ لارڈ میکالے کی مشہور و معروف کمیٹی کی روداد کس کی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ سوال یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے یا نہیں۔ خود انگلستان میں اس مسئلہ کے موافق و مخالف دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ سوال اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ جب تک حل نہ ہوا کسی کو چین نہ پڑا۔ ہندوستانی دل میں

سمجھتے ہوں گے کہ اللہ میاں نے کیسے فرشتوں کو ہم پر حکومت کرنے کے لئے بھیج دیا ہے جو ہماری تعلیم کے لئے یوں گھلے جا رہے ہیں۔ وہ جماعت جو انگریزی تعلیم کی مخالف تھی اس کے دلائل بڑے قوی تھے۔ لیکن لارڈ میکالے نے اس کے خلاف ایک ایسی محکم دلیل پیش کی کہ جس کے سامنے فریق مخالف کے تمام دلائل دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے کہا کہ انگریزی تعلیم دینے سے آہستہ آہستہ ہندوستانی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو گی لیکن خیالات، رجحانات، تہذیب، معاشرت کے لحاظ سے یکسر مغربی ہو گی اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنی مخصوص تہذیب و تمدن کو کھو بیٹھی تو وہ ایک ایسا جسم بنکے رہ جاتی ہے جس سے روح پرواز کر چکی ہو۔ چنانچہ اس دلیل کو بڑا وزن دار سمجھا گیا اور ۱۸۳۵ء میں فیصلہ ہو گیا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہونا چاہئے۔ یہ تو تھا بنیادی مسئلہ۔ اب یہ معاملہ پیش ہوا کہ اس طریق تعلیم میں جاذبیت کیسے پیدا کی جائے۔ تو اس کے لئے ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہسٹنگز نے اعلان کر دیا کہ ملازمت میں ترجیح اس کو دی جائے گی جو انگریزی جانتا ہو۔ یعنی جس طرح کتے کو مارنے والا زہر حلوہ میں لپیٹ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اس تعلیم کو روٹی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا۔ ہندوؤں پر تو اس طریق تعلیم کا کوئی مضر اثر نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں، تمدن نہیں، مذہب نہیں، اس لئے ان سے چھن کیا سکتا تھا، ان کو نقصان کچھ نہ ہوا اور روٹی ضرور مل گئی لیکن مسلمان پر اس کا کیا اثر ہوا۔ یہ ہم سے نہیں خود ایک فاضل انگریز سے سنئے کہ "اس طرح بتدریج اسلامی ہندوستان دار الحرب بنا دیا گیا اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی"[1]

ہندو ذہنیت وہ دور اب ختم ہو رہا ہے۔ حکومت اور قوت رفتہ رفتہ انگریز کے ہاتھ سے چھن کر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے۔ مسلمان کی تخریب اور بربادی میں جو کچھ انگریز نے کیا وہ سارا نقشہ ہندوؤں کے سامنے ہے اور چونکہ ہندو نے سیاست سیکھی ہی انگریز سے ہے اس لئے

[1] The Indian Musalmans by Dr. Hunter.

آنچہ استاد ازل گفت ہماں مے گویم

جو کچھ اُن کے استادوں نے کیا وہی کچھ یہ کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک گروہ تو ڈاکٹر مونجوں اور بھائی پرمانندوں کا ہے جو علانیہ کہتے پھرتے ہیں کہ بھارت ماتا کی پوتر بھومی ان ملیکش مسلمانوں کے چرنوں سے اپوتر نہیں رکھی جا سکتی۔ انہیں یا تو ہندو بن کر رہنا ہوگا یا عرب کی طرف چلے جانا پڑے گا۔ لیکن یہ طریق کار اس دور جاہلیت سے ملتا جلتا ہے جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں۔ اس لئے انہی میں کا دوسرا گروہ اُس طریق کار کو ترجیح دیتا ہے جو "دورِ تہذیب" کی ایجاد ہے، اور جس پر انگریز عمل پیرا رہا ہے یعنی وہ ایک صحیح شفیق بنتا ہے، وہ ایک سادھو منش، خدا رسیدہ، مہاتما کا چولا پہنتا ہے، اور ایسا ہم رنگِ زمیں دام بچھاتا ہے کہ بھولے بھالے پرندے سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہاں کوئی پھانسنے کی ترکیب بھی کر رکھی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی ایک عرصہ سے اپنے آپ کو عملی سیاست سے الگ بتا رہے ہیں، حتیٰ کہ جب کانگریس کے کسی طرزِ عمل کے متعلق ان سے شکایت کی جاتی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ بابا! میں تو چار آنہ والا" ممبر بھی نہیں ہوں، میں ایشور بھگتی میں لگا ہوا ہوں، مجھے دنیا داروں کے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ۔ جب انھوں نے عملی سیاست کو چھوڑا تو سب سے پہلے اچھوتوں کے ادھار (اِصلاح) کی اسکیم کو ہاتھ میں لیا، انھوں نے دیکھ لیا کہ آئندہ ہندوستان کا نظامِ حکومت جمہوری ہوگا جس میں تمام امور کا فیصلہ کثرتِ رائے، یعنی آبادی کے شمار کے اعتبار سے ہوگا، جو قوم تعداد میں زیادہ ہوگی وہی حکومت کرے گی۔ اچھوتوں کے ساتھ جو سلوک ہندوؤں نے روا رکھا ہے وہ خود اچھوتوں کی حالت سے ظاہر ہے۔ آج چونکہ عام بیداری کا زمانہ ہے اس لئے اچھوتوں نے بھی اپنی ذلت و خواری کا احساس کیا۔ مہاتما جی کو فکر لاحق ہوگئی کہ اگر انھوں نے، اُن مظالم کے انتقام کے طور پر جو ہندوؤں نے صدیوں سے اُن پر توڑ رکھے ہیں، یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ ہندوؤں سے الگ ہوتے ہیں، تو سوراج کس کام کا۔ فوراً نوعِ انسانی کی ہمدردی کی رگ ان کے نحیف و لاغر جسم میں پھڑک اٹھی، پست و زبوں حال اچھوت کی دکھ بھری داستان نے ان کا جگر خون کر دیا، ان پر رات کی

نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا۔ پونا میں پران تیاگ برت رکھا گیا اور جب تک یقین نہیں ہوگیا کہ اچھوت مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے آپ کو ہندو ہی لکھوائیں گے کسی اور طرف توجہ ہی نہیں کی۔ یہ مہاتما جی کی زندگی کا پہلا نصب العین ہے۔

اس کے بعد ایک اور اہم مسئلہ ان کے سامنے آیا۔ وہ بساطِ سیاست کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ملک کی زبان ہندی نہیں ہوجاتی، اقلیتیں اکثریت کے اندر جذب نہیں ہوسکتیں۔ زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے اس کا ذکر ہم آگے چلکر کریں گے۔

اس مسئلہ میں جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ ہوگا وہی جو وہ چاہتے ہیں تو اب ایک قدم اور آگے بڑھے۔ وہی چیز جو میکالے کے وقت میں انگریز کے پیش نظر تھی، وہی ان کے سامنے آئی۔ انگریز کی سیاست نے انہیں خوب بتا رکھا تھا کہ یاد رکھو جو قوم اپنی تہذیب، کلچر، مذہب کو الگ رکھنے کی متمنی ہو اسے علانیہ شدھ کرنے کو نہ اٹھو، بلکہ طریقِ تعلیم بدل دو، تھوڑے عرصے کے بعد وہ خود بخود شدھ ہوجائے گی۔ چنانچہ اس چیز کے پیش نظر مہاتما جی نے آزاد ہندوستان کے لئے ایک تعلیمی اسکیم کے اصول وضع کئے جسے وارڈھا اسکیم کہتے ہیں، اور ان اصولوں کی فروعات وجزئیات مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنادی۔ چونکہ خطرہ تھا کہ مسلمان اعتراض کریں گے کہ ہندوؤں کی وضع کردہ اسکیم ان پر کیوں نافذ کی جارہی ہے، اس لئے اس کمیٹی کے صدر ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل، جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بنادیئے گئے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مرتب کی جو رسالہ جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہی وہ رپورٹ ہے جس کے متعلق ہم کو دیکھنا ہے کہ اس طریقِ تعلیم کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا، اور مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے اسے کس حد تک تسلیم کرسکتے ہیں۔ دنیا کا کوئی معاملہ ہو، ایک مسلمان کے لئے لازمی ہے کہ اسے قرآن کریم کی میزان سے تولے اور جو فیصلہ اس بارگاہ سے ملے، اسے اپنے لئے قولِ فیصل سمجھے کہ:۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

جو شخص معاملات کا فیصلہ قرآن کریم کی رو سے نہیں کرتا اُسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں،

وہ کفار کے زمرے میں شامل ہے۔

ہمیں اس سے نہ مہاتما گاندھی کی ذاتی مخالفت مقصود ہے، نہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ موجودہ وقت، سیاستِ ہند میں ایک بڑا نازک وقت ہے، سابقہ حکومت کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور اس کی جگہ مقدرات کے نئے نئے ستارے منصۂ شہود پر آرہے ہیں، مسلمان سابقہ دورِ حکومت میں جس قدر نقصان اٹھا چکا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ مستقبل کے لئے اس کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں، یہ سوچے، غور کرے کہ میرے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم اس تعلیمی اسکیم کو خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں، اور ہمیں جہاں جہاں خطرات پوشیدہ ملیں، انہیں بے نقاب کر کے مسلمان کے سامنے رکھ دیں تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ اب کس طرح

مری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

متحدہ قومیت کی تشکیل سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مستقبل کے ہندوستان میں ہندوؤں کے ارادے کیا ہیں، تحریکِ آزادی کا مطمحِ نگاہ کیا ہے۔ تفصیل تو اس کی طول طویل ہے لیکن دو لفظوں میں ہندوؤں کا اس سے مقصود یہ ہے کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو" (پنڈت جواہر لال نہرو۔ مضمون مطبوعہ رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء)۔ یہ متحدہ قوم پیدا کیسے ہوگی؟ اس کے لئے یو۔ پی کے کانگریسی وزیر تعلیم سوامی سمپورنا نند کی وہ تقریر ملاحظہ فرمایئے جو گذشتہ اپریل میں انھوں نے تعلیم کے موضوع پر فرمائی تھی، جس کے دوران میں وہ کہتے ہیں:۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہئے ...... جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ

رہ سکے گی" (بحوالہ ٹریبیون و مدینہ)

ایک دفعہ پھر سُن لیجئے کہ ہندوؤں کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں۔ کوئی خاص مذہب نہیں۔ اسلئے آپ جب کبھی یہ سُنیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخصوص تہذیب کو مٹایا جائے تو بلا تامل سمجھ لیجئے کہ اس سے مقصود مسلمانوں کی تہذیب و مذہب کو مٹانا ہے۔ ہندو کا لفظ ساتھ اس لئے چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ مسلمان بدک نہ جائیں۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جب ہندوؤں کی کوئی تہذیب نہیں، کوئی مذہب نہیں تو اُن کا مٹے گا کیا۔ یہ کہنے والے ہم نہیں ہیں کہ ہندوؤں کا کوئی مذہب نہیں، کوئی تہذیب نہیں۔ خود ہندوؤں سے سُنیئے:-

"ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارودک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندو مت اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا، اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں"

(پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانحعمری ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۲۰۲-۲۰۳)

تو آپ سمجھ گئے کہ ہندوؤں کے پیشِ نظر سب سے مقدم یہ مسئلہ ہے کہ مسلمان کی الگ مخصوص تہذیب کو مٹا دیا جائے تاکہ یہ متحدہ قومیت میں جذب ہو جائے اور اس طرح ایک ایسی قوم کا وجود عمل میں آجائے جو نام کے اعتبار سے تو مسلمان رہے لیکن تہذیب و تمدن، خیالات، رجحانات، معاشرت کے لحاظ سے خالص ہندی ہو۔ وہی نظریہ جو میکالے کے سامنے تھا اور جس کے حصول کے لئے انگریزی طرزِ تعلیم کو اختیار کیا گیا تھا۔ اب اسی مقصد کے حصول کے لئے ایک نیا طریقِ تعلیم آسمان واردھا سے الہام

کی شکل میں نازل ہوا ہے جس کی تشریح شیخ الجامعہ نے فرمائی ہے۔ یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میکالے اسکیم میں کشش پیدا کرنے کے لئے روٹی کی جاذبیت چھپاں کی گئی تھی۔ وار دھا اسکیم کی بنیاد بھی روٹی پر رکھی گئی ہے۔ شروع سے اخیر تک اس اسکیم میں روٹی اور روٹی ہی کا شور ہے۔ یعنی مقصد اوّلین تو یہ ہے کہ اس طریق تعلیم سے مسلمانوں کو ان کے مذہب اور اسلامی فلسفۂ زندگی سے بیگانہ بنا دیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا وجود عمل میں آجائے۔ لیکن جو نصاب تجویز ہوا ہے اس میں نبظاہر بنیادی چیز صنعت و حرفت کی تعلیم رکھی گئی ہے تاکہ نگاہیں اس حصہ کے فوائد میں الجھ کر رہ جائیں، اور دوسرے حصہ کے نقصانات کی طرف توجہ نہ ہونے پائے۔ چنانچہ نصاب تعلیم میں ساڑھے پانچ گھنٹے میں سے ساڑھے تین گھنٹے کے قریب دستکاری کی تعلیم کے لئے رکھے گئے ہیں۔ اس سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ جہاں تک مسلمانوں کی ملّی خصوصیات مٹانے کا تعلق ہے ہندو کس طرح انگریز کے قدم بقدم جا رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انگریز نے جو کچھ کیا اس کے نتائج کا نام غلامی تھا، اور ہندو جو کچھ کر رہا ہے اس کا نام حصولِ آزادی رکھا گیا ہے۔ انگریز جن کے توسط سے یہ کچھ کراتا تھا ان کا نام ٹوڈی تھا۔ لیکن ہندو جن کے ہاتھوں سے یہ کچھ کراتا ہے وہ محبِ وطن، اور خادمِ ملت کہلاتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ:۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّہی، وہی مرحبی وہی عنتری

غیر مسلم کی راہ نمائی یہ طویل تمہید اس لئے ضروری تھی کہ جب تک کسی تحریک کا پس منظر (Back ground.) آپ کے سامنے نہ ہو، آپ پر اس کے صحیح اثرات و نتائج واضح نہیں ہو سکتے۔ اسکیم زیر نظر میں سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ وہ مسلمان جو دنیا کی امامت کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس کی آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ دنیا کی ہر شاہراہ پر غیر مسلموں کی راہ نمائی کا محتاج ہو چکا ہے۔ "غلام" مسلمان اپنی ہدایت و راہ نمائی کے لئے سمائے شملہ و لندن کے "الہامات" کا منتظر رہتا تھا۔ اب "آزاد" مسلمان اپنی ہدایت

کے لئے وار دھا اور آنند بھون کے دیوی دیواروں کی طرف کان لگائے رہتا ہے۔ انگریز سے اس کے کسی فیصلے یا ہدایت کی دلیل مانگنا آئینِ وفاشعاری کے خلاف تھا کہ اس کے فیصلوں کی صحت کی دلیل اس کا "اقبالِ حکومت" تھا۔ گاندھی جی سے ان کے فیصلوں یا ہدایات کی دلیل مانگنا خلافِ رسم پرستاری ہے کہ ان کے ہر فیصلے کی صحت کی دلیل وہ "اندرونی روشنی" ہے جس کی بنا پر انہیں معصوم عن الخطاء، مافوق البشر انسان، یعنی اوتار سمجھا جاتا ہے۔ انگریز کی غلامی استبداد کی غلامی تھی۔ گاندھی جی کی غلامی عقیدت کی غلامی ہے۔ مسلمان کے لئے نتیجہ دونوں کا وہی ذلت و پستی ہے، جسے جذبۂ مرعوبیت (Inferiority Complex.) کہتے ہیں[۱]۔ چنانچہ جناب ڈاکٹر صاحب ممدوح اپنی رپورٹ کو مہاتما جی کے روبرو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"ہم یہ رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سچے دل سے امید کرتے ہیں کہ آپ کی رہنمائی میں یہ اسکیم ہمارے ملک میں تعلیم کے ایک اچھے نظام کی بنیاد ثابت ہوگی" (صفحہ ۱۰۸)

تعلیم کے بنیادی اصولوں کی تمہید میں رقمطراز ہیں۔

"اور میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مہاتما گاندھی کی سوجھ بوجھ اور رہنمائی آڑے وقت میں ہمارے کام آئی" (صفحہ ۱۱۱)

اللہ اکبر! وہ مسلمان جس کے متعلق ارشاد تھا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم نوعِ انسانی میں سے بہترین قوم ہو)، جس کی شان یہ تھی کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنا دیا تاکہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کے نگراں رہو)، جس کا مرتبہ یہ تھا کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (تم ہی

[۱] ترجمان القرآن۔ یہ ذہنی غلامی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ حال ہی میں شملہ کی ایک علمی صحبت میں ایک مولوی مسلمان نے کہا کہ "میرے نزدیک حق وہ ہے جو گاندھی جی کی زبان سے نکلے"!

دنیا میں سب سے بلند و بالاتر ہو، جس کے قومی باپ کے متعلق ارشاد تھا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (ہم نے تمہیں انسانوں کا امام، پیشرو، لیڈر بنایا ہے) جن کو حکم تھا کہ "دیکھنا غیر مسلموں کے خیالات کا اتباع نکرنا وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے"، ان مسلمانوں کی آج حالت یہ ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کے مسئلہ کے حل کے لئے ایسے لوگوں کے دست نگر ہیں جو روح اسلام سے یقیناً بیگانہ ہیں۔ جس مومن کی شان تھی کہ،

موسنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

وہ مومن آج ایسے انسانوں سے ہدایت کا طالب ہے جن کی عقل آج تک انہیں اتنا بھی نہیں بتا سکی کہ ایک مٹی کے بت کے سامنے ماتھا ٹیکنا کوئی شرفِ انسانیت نہیں ہے۔ یہ پستیوں کی حد نہیں تو اور کیا ہے۔

اصل رپورٹ رپورٹ زیرِ نظر کے مطابق یہ نیا طریق تعلیم سات برس سے چودہ (۱۴) برس کے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے لازمی ہوگا (ص۱۳۱) یعنی کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ جب اس کی لڑکی یا لڑکا سات برس کا ہو جائے تو اسے اس اسکول میں نہ بھیجے جس میں یہ طریق تعلیم رائج ہو۔ یہ تعلیم جبری ہوگی۔ انگریز نے اپنے طریق تعلیم کو جبری نہیں بنایا تھا۔ یہ کمی اب سوراج کے زمانہ میں پوری ہوگی۔

اب سب سے پہلے اس نصاب کو دیکھ لیجئے جو اس اسکیم کی رو سے مرتب کیا گیا ہے:۔

۱۔ بنیادی دستکاری	....	۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ
۲۔ گانا، ڈرائنگ اور حساب	....	۴۰ منٹ
۳۔ مادری زبان	....	۴۰ منٹ
۴۔ سماج کا علم اور عام سائنس	....	۳۰ منٹ
۵۔ کسرت	....	۱۰ منٹ
۶۔ بیچ کا خالی وقت	....	۱۰ منٹ
میزان	......	۵ گھنٹے ۳۰ منٹ (ص۱۳۱-۱۳۲)

آپ کو یہ نصاب بڑا معصوم سا نظر آئے گا۔ اس میں بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں جس سے مسلمانوں کو خواہ مخواہ خطرات کا اندیشہ ہو لیکن یہ خطرات اس نصاب کی تفصیل کے اندر ہیں۔ آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا کہ اس نصاب میں مذہب کا کہیں نام نہیں۔ خود گاندھی جی اور اس اسکیم کے مرتب کرنے والے یہی اعلان کر رہے ہیں کہ ہم نے مذہب کو اس اسکیم سے بالکل الگ رکھا ہے لیکن جب ہم اس نصاب کی تفصیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ مذہب کا عنوان تو اس میں کہیں نہیں لیکن مسلمانوں کا مذہب اور ان کی تہذیب مٹانے کے لئے اس میں سب کچھ ہے اور وہ کچھ اس انداز سے رکھا گیا ہے کہ تاوقتیکہ گہری نظر سے نہ دیکھا جائے، اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں لگ سکتا۔ اس کا تجزیہ کرنے کے لئے اس اسکیم کو چار اہم عنوانات کے ماتحت مختلف ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :۔

(اوّل) مذہب کا مسئلہ جو بمنزلہ روح ہے۔

(دوم) فلسفۂ زندگی کا مسئلہ جو تہذیب اسلامی کی اصل ہے۔

(سوم) زبان کا مسئلہ جس پر کسی قوم کے کلچر (ثقافت) کا انحصار ہے۔

(چہارم) معاشرتی زندگی جو کسی قوم کے رجحانات قلبی و ذہنی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

آئندہ صفحات میں ان مسائل پر مختلف ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ اوّل و دوم چونکہ مقابلۃً زیادہ اہم اور پیچیدہ ہیں۔ اس لئے اُن پر نسبتۃً شرح و بسط سے تبصرہ کیا جائے گا۔ شقِ سوم ایک الگ مضمون کی محتاج ہے، اور شقِ چہارم میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

باب اوّل

مذہب کا مسئلہ

نصاب میں جو عنوان "سماج کا علم" ہے اس کی تفصیل رپورٹ کے صفحات ۱۱۸-۱۱۹ پر دی ہوئی ہے۔

مذہب کے متعلق اس میں لکھا ہے۔

"دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں" (۱۰)

اس اجمال کی تفصیل کے لئے وہ بیان ملاحظہ فرمائیے جو مہاتما گاندھی نے اخبارات میں شائع کیا ہے۔ یہ بیان ایک وفد کے سوالات کے جواب میں شائع ہوا ہے جو یہ دریافت کرنے کے لئے مہاتما گاندھی کے پاس گیا تھا کہ واردھا اسکیم میں مذہب کی کیا پوزیشن ہوگی۔ آپ نے فرمایا:۔

"ہم نے واردھا اسکیم میں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا ہے کیونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ جس طرح مذاہب کی آجکل تعلیم دی جاتی ہے اور اُن پر عمل کیا جاتا ہے، وہ بجائے اتحاد کے اختلاف پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس میرا یہ خیال ہے کہ سچائیاں، جو ہر ایک مذہب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں، بچوں کو پڑھائی جا سکتی ہیں اور ضرور پڑھائی جانی چاہئیں۔ یہ سچائیاں الفاظ یا کتابوں کے ذریعے سے پڑھائی نہیں جا سکتیں۔ بچے اِن سچائیوں کو اپنے استادوں کی روزانہ زندگی سے سیکھ سکتے ہیں، اگر وہ اُستاد خود مذہب کی سچائیوں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو۔ صرف ایسی صورت میں بچے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ واقعی سچائیاں اور عدل و انصاف تمام مذاہب کے بنیادی اصول ہیں"

جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا سات سے چودہ برس کی عمر کے بچے تمام مذاہب کی یکساں عزت کرنا سیکھ سکیں گے، تو مہاتما جی نے فرمایا:۔

"ہاں میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت کہ تمام مذاہب اہم اصولی باتوں میں بالکل ایک جیسے ہیں (بچوں کے دل میں یہ بات پیدا کر دے گی) کہ وہ دوسروں کے مذہب کی بھی ویسی ہی عزت کریں جیسی اپنے مذہب کی کرتے ہیں۔ یہ بڑی سادہ سی سچائی ہے اور سات برس کے بچے اسے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن سب سے مقدم یہ ہے،

کہ استاد خود ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہو" (نیشنل کال، مورخہ ۸ جون ۱۹۳۸ء)

بظاہر یہ اصول آپ کو بڑی وسعتِ نظر، کشادہ ظرفی پر مبنی نظر آئے گا، لیکن یہی وہ خطرناک گھاٹی ہے جہاں مسلمانوں کا مذہب تباہ کیا جائے گا۔ یاد رکھئے، مہاتما گاندھی اپنے الفاظ کے انتخاب میں بڑے ہوشیار واقع ہوئے ہیں، ان کی سطح ساکت و صامت دریا کی روانیوں کی طرح ہوتی ہے لیکن ان کے نیچے بڑے بڑے خطرناک اژدہے چھپے ہوتے ہیں۔ سطح بین نگاہیں اُن کی نظر فریب کشش سے دھوکا کھا جاتی ہیں۔ جو سطح سے ذرا نیچے اتر جائیں، انہیں وہ خطرات بے نقاب نظر آجاتے ہیں۔ وہ عظیم الشان سازش، جو ان الفاظ کی معصومیت کے اندر نقاب پوش ہے، اسے بے نقاب کرنے کے لئے ہمیں ذرا تفصیل سے کام لینا ہوگا۔

مذہب کی تشریح مذہب میں ایک تو وہ مہمات اصول ہوتے ہیں جن پر اعتقاد کا دار و مدار ہوتا ہے، ان اصولوں کو ایمانیات کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ان اصولوں کی تفصیلات میں قوانین، عبادات، مناسک و شعائر یعنی ظواہر ہوتے ہیں جنہیں شریعت کہا جاتا ہے۔ ایمانیات یعنی اصولوں کا تعلق قلب و دماغ سے، سمجھنے سمجھانے سے ہوتا ہے اس لئے یہ غیر محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن مذہب کی بنیاد انہی پر ہوتی ہے۔ ظواہر کا تعلق اعمالِ حیات سے ہوتا ہے، اس لئے وہ محسوس ہوتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دو مختلف مذہب، مثلاً اسلام اور ہندو مت میں شرع و منہاج کا فرق تو محسوس فرق ہے، کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے طریق نماز اور ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں کس قدر اختلاف ہے؟ ان محسوس و مشہود اختلافات کی موجودگی میں کسی کے سامنے یہ کہنا کہ اسلام اور ہندو مت دونوں یکساں مذہب ہیں، اپنی ہنسی اڑانا ہے۔ اس لئے مہاتما گاندھی نے اس چیز کو تو چھوا نہیں، البتہ اس کے متعلق یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ یہ محسوس اختلافات کوئی اہم باتیں نہیں ہیں۔ یہ ثانوی (Secondary.) چیزیں ہیں۔ اصل مذہب تو وہ اصول ہیں جن کو وہ عالمگیر سچائی کہتے ہیں۔ یہ چونکہ غیر محسوس ہیں، ان کا اختلاف آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا، لہٰذا یہ اعلان کر دیا کہ جہاں تک مذہب کے اصولوں کا تعلق ہے

اسلام اور ہندومت بالکل یکساں مذہب ہیں، دونوں میں اصولی سچائیاں ایک جیسی ہیں، اسلام کو ہندومت پر کوئی برتری اور تفوق حاصل نہیں۔ یہ دعویٰ بڑا آسان ہے، اس لئے کہ ایمانیات کا فرق، اصولی سچائیوں کا اختلاف، محسوس شے نہیں۔ مثلاً مسلمان بھی خدا پرست ہے اور ایک ہندو کو بھی دعویٰ ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے، اس لئے اس اصولی مسئلہ میں دونوں یکساں ہیں۔ سطح بین نگاہیں فوراً اس دھوکے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے کہ ہندو کی خدا پرستی اور مسلمان کی خدا پرستی میں کیا فرق ہے دونوں مذاہب کی مزعومہ یا حقیقی آسمانی کتابوں میں سے خدا کے تصور کو واضح طور پر سمجھانا پڑے گا۔ یہ ذرا مشکل مرحلہ ہے اور ہر شخص کے ذہن میں یہ بنیادی فرق راہ چلتے نہیں بٹھایا جا سکے گا۔ لہٰذا یہ وہ مقام ہے جہاں نہایت آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ عیسائیت کو اسلام سے ہمیشہ یہی خطرہ رہا کہ بہاتِ اصول میں جب دونوں کا باہمی موازنہ ہوگا تو عیسائیت ایک سیکنڈ کے لئے بھی سامنے ٹھہر نہ سکے گی۔ اس لئے انھوں نے ہمیشہ حقائق کو چھوڑ کر خالی جذبات کی راہ سے اسلام کا مقابلہ کرنا چاہا۔ ہندوؤں کو معلوم ہے کہ ایمانیات یعنی اصولِ مذہب میں جب کبھی ہندومت اسلام کے سامنے آیا تو یہ مت شیشہ کی طرح چور چور ہو جائے گا۔ اس لئے ہندوؤں نے اپنی اس بنیادی کمزوری کو چھپانے کے لئے مدت سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ یہ مشہور کیا جائے کہ **بنیادی** سچائیوں کے لحاظ سے تمام مذاہب ایک جیسے ہیں کسی میں کچھ فرق نہیں۔ کسی کو دوسرے پر بڑائی حاصل نہیں۔ فرق صرف ظواہر (یعنی شریعت) میں ہے اور شریعت کچھ ایسی اہم شے نہیں، بلکہ مذہب کے جتنے جھگڑے ہیں وہ شریعت کے اختلافات کی وجہ سے ہی ہیں۔ یعنی محسوس اختلافات کو فتنہ و فساد کا موجب قرار دے دیا جائے اور غیر محسوس بنیادی اصولوں کو ہندومت اور اسلام میں قدر مشترک (Common factor.) قرار دے دیا جائے۔

یہ ایک بڑی گہری سازش ہے جو مدت سے اسلام کے خلاف آتشِ خاموش کی طرح پھیلائی جا رہی ہے۔ اس کی ابتدا اکبر کے دینِ الٰہی سے ہوئی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ مختلف مذاہب

عالمگیر سچائیوں کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہیں۔ یہ وہ فتنۂ عظیم تھا جس کو حضرت امام سرہندیؒ نے مسلسل جہاد سے کچلا، اور مختلف بزرگانِ دینؒ نے بڑی بڑی قربانیوں سے اس سیلابِ بلا انگیز کو آگے بڑھنے سے روکا۔ یہ وہی دینِ الٰہی ہے جس کے متعلق بہار کے مسلمان کانگرسی وزیر، ڈاکٹر سید محمود نے لکھا ہے کہ "مستقبل کے آزاد ہندوستان میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کا یہی مذہب ہونا چاہئے"(ملاحظہ ہو سوراجی اسلام مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء)

جب دینِ الٰہی کی اس سازش نے وہاں شکست کھائی تو اس نے تصوف کے راستے سر نکالا اور یہ مشہور کیا کہ مسلمانوں کا تصوف اور ہندوؤں کی ویدانت ایک ہی ہے، اور چونکہ مغز دین یہی حقیقت ہے اس لئے یہ دونوں مذہب ایک ہی ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ کئی ہندو مسلمان فقیروں کے معتقد بن بیٹھتے ہیں۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کے ماتحت مشاہیرِ اسلام میں سے حضرات علماء، صلحاء، مجاہدین ملت کے مقابلہ میں صوفیائے کرام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن تصوف پھر بھی گوشوں اور زاویوں میں چھپنے کا مسلک تھا، اس لئے دنیائے معاشرت میں یہی نظریہ "برہمو سماج" کی شکل میں ابھارا گیا، جو آج عملاً عام طور پر ہر قوم پرست مسلمان کا مذہب بن رہا ہے۔ جب زمین یوں ہموار ہو گئی تو گاندھی جی ایک قدم اور آگے بڑھے اور اپنی اسکیم میں مذہب کے متعلق یہی نظریہ تعلیم کا جزو لازم قرار دیدیا۔

آپ سمجھے بھی کہ اس سے نتیجہ کیا نکلا؟ ہندومت جو اسلام کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے بھی ٹھہر نہ سکتا تھا، جسے مہذب محفلوں میں پیش کرتے ہوئے خود ہندو گھبراتے اور شرماتے تھے، وہ ایک ہی جست میں ان پستیوں سے ابھر کر اسلام کے ہمدوش کھڑا ہو گیا اور اسلام گاندھی جی کی معصوم کمند کے ایک جھٹکے میں عرش کی بلندیوں سے تحت الثریٰ کی پستیوں میں آگرا۔ آپ شاید یہ کہہ دیں کہ واہ صاحب! ایک مہاتما گاندھی کے ایسا کہدینے سے کیا ہوتا ہے جب کہ خود کانگرس کے اندر اسلام کی برتری اور فوقیت کو ثابت کرنے والی اتنی اتنی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ لیکن جب آپ گاندھی جی کی نگاہ دور بیں کی

حقیقت سے واقف ہو جائیں گے اور کانگریس کے محافظینِ اسلام آپ کے سامنے بے نقاب آئیں گے تو اس وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلام کی فوقیت اور برتری ثابت کرنے والے کہاں ہیں! مہاتما گاندھی کو جو بات دس سال بعد زبان پر لانی ہوتی ہے، اس کی بنیاد وہ آج رکھ دیتے ہیں۔ پھر وہ ایسی کچی گولیاں بھی کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے جال وہ کھلے بندوں اپنے ہاتھوں سے بچھاتے پھریں۔ انھوں نے اپنے اُستادانِ سیاست سے یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ حرمِ کعبہ کے اندر ترکوں کے سینہ کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لئے کسی غیر کو نہ بھیجو، بلکہ خود وہیں سے کوئی "شریف حسین" تیار کرو۔ لہذا گاندھی جی بھی مسلمانوں کی ہلاکت کے لئے مسلمانوں ہی کو تیار کرتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۳-۱۹۱۲ء سے ایک تفسیر قرآن لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کئی دفعہ اس کے لئے چندے ہوئے اور کئی مرتبہ اس کے مسودے گم ہوئے۔ وہ تفسیر نہ چھپنی تھی او نہ چھپ سکی، حتیٰ کہ انھوں نے تحریر کا مشغلہ کم و بیش چھوڑ دیا، اور اپنی توجہات دوسری طرف منعطف کر لیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ ۱۹۳۱ء میں جب کہ وہ پکّے نیشنلسٹ ہو چکے تھے، اُن کی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد چھپ کر سامنے آگئی۔ اس تمام تفسیر کو تو کس طرح آپ کے سامنے لایا جائے البتہ انھوں نے تفسیر کے مقدمہ (یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ)، کے ضمن میں مختصاً بیان کیا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی تمام تفسیر کو (Sum up.) کیا ہے۔ یہ (Summary.) قابلِ ملاحظہ ہے۔ دینِ الٰہی کو سامنے رکھئے، برہمو سماج کے عقائد پر نگاہ ڈالئے، پھر گاندھی جی کے نظریۂ مذہب کو سامنے رکھئے۔ اور اس کے بعد مولانا آزاد کی تشریح دین پڑھئے۔ ساری حقیقت آپ کے سامنے روشن ہو جائے گی۔ یہ بتانے کے بعد کہ مختلف مذہبی گروہوں نے دین کے سمجھنے میں کیا کیا غلطیاں کیں۔ اسلام کے متعلق ارشاد ہے:۔

"لیکن قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا:۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی تبلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ بلکہ صاف صاف کہدیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا کہ دین خدا کی بخشش ہے اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(ب) اس نے کہا، خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لئے ہے، پس پیروان مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے دینِ الٰہی کی وحدت فراموش کرکے الگ الگ گروہ بندیاں کرلی ہیں، اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

(د) اس نے تبلایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی آیا اور ایک ہی طرح سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا، کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی، اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جاسکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کردی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ہ) اس نے تبلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو شخص بھی ایمان اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے، خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کردیا کہ اس کی دعوت کا مقصد

اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انھوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترکہ اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے"

(ترجمانُ القرآن۔ جلد اوّل صفحہ ۱۶۳-۱۶۲)۔

حقیقی اسلام اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے ــــ اور تمام مذاہبِ عالم میں صرف اسلام ہی کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے جو خدا کا پیغام ازلی لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی دعویٰ ہے ــــ اور کس قدر حقیقت پر مبنی دعویٰ ــــ کہ وہ سچّائیاں، وہ پیغامِ ازلی، وہ دینِ خداوندی، دنیا میں کسی قوم کے پاس باقی نہ رہا، یا تو وہ حوادثِ ارضی وسماوی کی نذر ہو گیا، یا انسانی ہاتھوں نے اس میں الحاق و تحریف کر دی، حق کو باطل کے ساتھ ملا دیا، دین کی صورت مسخ ہو گئی، اور اس ضرورت کی بنا پر کہ دنیا میں کہیں خدا کی سچائیاں باقی نہ رہی تھیں، (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ خشکی اور تری میں فساد ہی فساد رونما ہو چکا تھا) خدا نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے اپنا پیغامِ ازلی قرآنِ کریم کی شکل میں نازل فرمایا جو تمام سابقہ سچّائیوں کا مہیمن ہے، یعنی جتنی سچائیاں خدا کی طرف سے آتی رہی تھیں پر لوگوں نے اُنہیں محفوظ نہ رکھا تھا، وہ سب اس کے اندر ہیں، اور ان کے علاوہ وہ تمام اصولِ زندگی جن کی قیامت تک انسانوں کو ضرورت پڑے گی، وہ بھی اس کے اندر ہیں۔ گویا یہ پیغامِ خداوندی کا مکمل اور آخری ضابطہ ہے۔ الدین اور الاسلام اس کے اندر آ کر مکمل بھی ہوا ہے (اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ) اور محفوظ بھی (نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ) اس کی حفاظت خود خدا کے ذمہ ہے۔

اس ضابطہ کے اجمال کی عملی تفصیل محمد الرسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہے اور یہ مہماتِ اصول اور ان کی عملی

تفصیل بل کر خدا کا سچا مذہب الاسلام بنتے ہیں۔ لہذا آج خدا کے نزدیک جو دین حقیقی ہے، جو سچا مذہب ہی، جو سچی شریعت ہے، وہ صرف وہی ہے جو قرآنِ کریم کے اندر ہے، جو شریعت محمدیہ کہلاتی ہے (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ) اب سچائیاں اور کہیں نہیں۔ اگر سچائیاں کہیں اور بھی ہوتیں تو قرآنِ کریم نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ تو نازل ہی اس لئے ہوا تھا کہ سچائیوں کا وجود دنیا سے گم ہو چکا تھا۔ لہذا آج دنیا کا کوئی مذہب، نہ اصول میں نہ شریعت میں، اس کے برابر ہوسکتا ہے نہ اس کا بدل (Substitute.)۔ اور آج الدین اور الاسلام کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھا جائے اور شریعتِ محمدیہ کا اتباع کیا جائے۔ جو ایسا نہیں کرتا نجات وسعادت کا قطعاً مستحق نہیں ہے۔ یہ قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے، اگر کسی کو اس میں ذرا بھی شک ہو تو وہ ہمیں اطلاع دے۔ ہم قرآنِ کریم کی نصوصِ صریحہ سے اسے واضح طور پر ثابت کر کے دکھادیں گے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر مولانا آزاد کی تفسیر کے مندرجہ صدر ٹکڑوں پر نگاہ ڈالئے۔

(الف) وہ فرماتے ہیں کہ: "ہر مذہب میں سچائی ہے، تمام مذہب سچے ہیں"۔

قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ ہر مذہب میں سچائی تھی۔ تمام مذاہب سچے تھے۔ لیکن قرآن کریم کے نزول کے وقت وہ سچائیاں گم ہو چکی تھیں۔ لہذا آج۔ سچائیاں صرف قرآن کے اندر ہیں دنیا میں اور کہیں نہیں ہیں۔

(ب) مولانا فرماتے ہیں کہ "پیروانِ مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گروہ بندیاں بنالی ہیں"۔

لیکن قرآن کریم مسلمانوں کو ایک الگ گروہ قرار دیتا ہے انہیں حزب اللہ (خدا کا گروہ) کہتا ہے[۵]۔ انہیں خیر امت اور امتِ وسطیٰ کے القاب سے یاد کرتا ہے (یعنی بہترین جماعت بہترین قوم) لہذا مسلمانوں کا

---

[۵] "خدائے تعالیٰ نے مومنین مخلصین کو حزب اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا ہے"۔ (مولانا آزاد الہلال ۱۳ ؎ ۲)

الگ گروہ قائم رہنا ان کی گمراہی نہیں۔ بلکہ ان کے خدا کا حکم ہے۔

(د) یہ درست ہے کہ دین ایک چیز ہے اور شرع و منہاج دوسری چیز لیکن یہ غلط ہے کہ دین (سب جگہ) ایک ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دین ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا تھا لیکن لوگوں نے اس کو بدل ڈالا۔ اور اب وہ صرف قرآن کریم کے اندر ہے۔ پھر یہ بھی درست نہیں کہ شرع و منہاج کا اختلاف یونہی معمولی سی بات ہے۔ شرع و منہاج وہ شے ہے جس کی خاطر رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے بحکم خداوندی اسی کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ شرع عملی تفصیل ہوتی ہے اصولِ دین کی، اس لئے جب اس وقت دین وہی دین ہے جو رسول اللہ صلعم لائے تو شریعت بھی وہی شریعت ہے جو اُن کی وساطت سے ملی۔ نہ دین کہیں اور سے مل سکتا ہے، نہ شریعت ہی غیر اہم شے ہے۔

(ہ) جیسا کہ (ج) میں بتایا جا چکا ہے یہ قطعاً دھوکا ہے کہ مسلمانوں کی "گروہ بندی" ان کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ یہ خدا ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ لہذا نجات و سعادت کے لئے متبعینِ محمدؐ رسول اللہ کی جماعت میں شامل ہونا ازبس ناگزیر ہے۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ "ظواہر و رسوم" کو نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں ظواہر و رسوم (مثلاً عبادت کے طریقے۔ حرام و حلال کا فرق) شریعت کہلاتے ہیں اور شریعت دین ہی کی تفسیر کا نام ہے۔ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے الفاظ بالکل مہمل ہیں اگر ان کی تشریح قرآن کریم کی رو سے نہ کی جائے۔ قرآنِ کریم کی رو سے "خدا پرستی" وہی خدا پرستی ہو سکتی ہے جو قرآنِ کریم کے متعین کردہ ایمان کے مطابق ہو۔ اور اعمال وہی نیک قرار پا سکتے ہیں، جن کو اس نے نیک اعمال کہا ہو۔

(و) یہ قطعاً غلط ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ تمام پیروانِ مذاہب سچے ہیں۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں مذاہب سب سچے تھے، لہذا پیروانِ مذاہب اگر آج "فراموش کردہ سچائی" کو از سرِ نو اختیار کرنا چاہیں تو سچائی چونکہ دنیا میں اور کہیں نہیں، اس لئے انہیں قرآن کریم پر ایمان لانا اور شریعتِ محمدیہ کا اتباع کرنا ہوگا، اور اس طرح مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونا

پڑے گا۔ یہ ہے "ارجُ الدین" "اوڈالاسلام" یہ ہم نہیں کہتے۔ خود مولانا آزاد بھی اپنے دورِ قومیت پرستی سے پیشتر یہی کہا کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا تو وہ دین قبول نہ کیا جائے گا۔ اس آیت کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں یوں کیا جاتا تھا:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

"اب سے جو انسان احکامِ اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو یقین کرو اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی اور اس کے تمام کاموں کا آخری نتیجہ ناکامی و نامرادی ہوگا" (الہلال ۲۴)

لیکن اسی آیت کا ترجمہ دورِ قومیت پرستی کے بعد یوں کیا جاتا ہے:۔

"اور جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا......

...... (ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۵۸)

اور اس "عالمگیر سچائی" کی تشریح آپ اوپر پڑھ چکے ہیں ۱۹۱۳ء میں "الاسلام" نام تھا "احکامِ اسلامی" کا، اور ۱۹۳۱ء میں وہ نام ہو گیا اس "عالمگیر سچائی" کا جو ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ حالات کے بدلنے سے آیات کے ترجمے تک بدل گئے۔ (باقی)

معرکۂ اسلام و جاہلیت

بَدَءَ الاسلامُ غریباً وسیعودُ غریباً

(۵)

(از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

ہم مضمون کی ابتدا میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ معقول خالص یعنی اسلام کا سرچشمہ انسان کی وہ سلیم اور بے آمیز فطرت ہے جو اسے حیوانی پستیوں سے اٹھا کر خلافت الٰہی کی بلندیوں تک لے جانا چاہتی ہے، اور یہی وہ جوہر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جاہلیت کا سرچشمہ نفس حیوانی ہے جو اس امتیاز کو فراموش کر دینا اور انسانیت وحیوانیت کے حدود کو محو کر دینا چاہتا ہے۔ جاہلیتِ اولیٰ کا جو حال ظہورِ اسلام کے وقت تھا اس کی اجمالی داستان آپ پڑھ چکے ہیں، جس میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس جاہلیت میں باوجود جاہلیت ہونے کے کچھ نہ کچھ حیا ضرور تھی۔ اس نے کم از کم انسان کا نام تو انسان باقی رکھ چھوڑا تھا۔ مگر آفریں ہو آج کی "مہذب" جاہلیت پر اور مبارک ہو اس کی شانِ فاتحیت اور اس کی بیباکانہ جرأت، کہ اس نے اس پردۂ حیا کو بھی اپنے چہرے سے نوچ پھینکا اور ڈاروِن کی ہمت نے —جو اس جاہلیتِ کبریٰ کی قائد بن کر سطح ارض کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ہے— امتیازِ انسانیت کے اس ننگ کو گوارا کرنے سے علی الاعلان انکار کر دیا۔ اب وہ اپنے آپ کو حیوان کہنے اور کہلانے پر مصر ہے۔ انسانیت کو ایک لفظ بے معنی، اخلاق کو معدہ کا تابع اور عقل و دماغ کو خواہشاتِ نفس

کا چاکر قرار دے رہی ہے، اور ایک طرف اپنے اس نظریہ کا زبان سے اقرار کر رہی ہے تو دوسری طرف اپنے نظامِ تہذیب اور دستورِ حیات کی اساس اسی نظریہ کو قرار دے چکی ہے۔ پھر بتاؤ اسلام کی اُن فطری تعلیمات اور عقلی نظریات سے اس مہذب دنیا کو کیا انس اور لگاؤ ہو سکتا ہے جن کی تہ میں سارے عناصر موجود ہیں لیکن حیوانیت اور نفسانیت کا کوئی عنصر نہیں؟ آخر دونوں کا یہ فطری بعد المشرقین، یہ اختلافِ مقاصد، یہ تضادِ افکار اور یہ تباینِ مزاجی کیوں کر ایک کو دوسری سے قریب ہونے دے گا؟ دو مختلف سمتوں کے مسافر کے قدم ایک دوسری کا ساتھ دے سکیں گے؟ اسلامی تصورات و نظریات اس تہذیب کے دماغ میں کس طرف سے گھس سکیں گے؟

جاہلیتِ قدیمہ خدا کی منکر نہ تھی۔ صرف خدائی کی وحدت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ الوہیت کو بشریت کی میزان میں تول کر قیاس کرتی تھی کہ ایک اکیلا خدا اتنے بڑے نظامِ کائنات کو کیسے چلا سکتا ہے۔ اس لئے وہ الوہیت کو بہت سے شرکاء اور مددگاروں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ تاہم اس نے الوہیت کو حکمت، علم، قدرت اور ارادہ سے منفک نہ کیا تھا۔ مگر اس نئی جاہلیت کو دیکھو۔ یہ سرے سے ایک حکیم و دانا فاعلِ مختار ہی کی ضرورت اس نظامِ کائنات کے لئے تسلیم نہیں کرتی۔ اس کو جس عقلیت (Rationalism.) پر ناز ہے، وہ کائنات کا انتظام ایک ایسی اندھی فطرت (Blind nature.) ایک ایسی جاہل طبیعت کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتی ہے جو نہ علم رکھتی ہے، نہ ارادہ، نہ کچھ سوچتی ہے، نہ دیکھتی ہے، نہ سنتی ہے۔ اس کے سامنے اگر آپ کہیں کہ گراموفون خود بخود بن گیا، یا اس کو ایک ایسی طاقت نے بنا دیا جو اندھی، بہری، بے عقل اور بے علم تھی تو وہ آپ پر ہنسے گی اور کہے گی کہ کیا جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ مگر خود وہ بے تکلف حکم لگاتی ہے کہ یہ عظیم الشان کارخانۂ عالم کسی صانعِ علیم و حکیم کے بغیر وجود میں آیا ہے اور اس کے بغیر چل رہا ہے، مادّے میں زندگی خود بخود ایک طبعی عمل سے پیدا ہو جاتی ہے، زندہ مادّے سے یہ بے شمار انواع نت نئے ڈھنگ پر خود بخود ایک طبعی ارتقاء کے ساتھ

منتی چلی جاتی ہیں، انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کو محض تنازع للبقاء (Struggle for existence.) اور انتخاب طبیعی (Natural Selection.) اور بقائے اصلح (Survival of the fittest.) نے کیڑے سے انسان بنا دیا، حتی کہ اس میں عقل ایک بے عقل طاقت نے پیدا کر دی، اس میں شعور ایک بے شعور قانون کے زور سے آگیا، اور اس میں محبت ایک ایسے منبع سے آگئی جہاں خود محبت موجود نہیں۔ ایسی ہولناک جہالت کی باتیں وہ کسی شرم کے بغیر کہتی ہے اور کسی شرم کے بغیر اُن کو سائنس اور حکمت اور عقلیت کے نام سے کتابوں میں لکھتی اور یونیورسٹیوں میں پڑھاتی ہے۔

پھر جہل مرکب ملاحظہ ہو کہ اس کو ہنسی اپنی جہالت اور بے عقلی کی باتوں پر نہیں، بلکہ اُن کی باتوں پر آتی ہے جو اسے حقیقت کا علم دینا چاہتا ہے، اور کائنات کے عقلی مطالعہ کا پہلا اور بنیادی سبق دیتا ہے۔ قرآن خدا کے وجود پر فطرت و وجدان کی شہادت پیش کرتا ہے تو وہ اسے وہم پرستی، جہالت، تنگ نظری بتاتی ہے۔ قرآن آفاق کائنات کے کھلے ہوئے آثار و بینات میں وجود باری کی جھلک دکھاتا ہے تو وہ منہ پھیر لیتی ہے اور خدا کے ہر معجزے کی "سائنٹفک توجیہیں" کرنے لگتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تم اینٹوں اور پتھروں کی ایک چھوٹی سی عمارت دیکھ کر یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ اس کا کوئی معمار نہیں اور نہ کسی مقصد سے یہ بنائی گئی ہے، تو کائنات کی اس وسیع عمارت کا جس کی وسعت تمہاری نگاہ و وہم سے بھی پرے ہے، اور جو ایک خاص شکل وضع، مقصد اور حکمت کے ماتحت بنی ہے، کوئی معمار — دانا اور حکیم معمار — کیوں نہیں مانتے؟ وہ جواب دیتی ہے کہ بے شک عمارت تو ایک دانا و بینا معمار کے بغیر نہیں بن سکتی، مگر اس کائنات کے متعلق ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ وہ اتفاقاً وجود میں آئی ہے اور اس کے قوانین ایک قانون بنانے والے کے بغیر خود بن گئے ہیں، اور ایک نافذ کرنے والے کے بغیر خود نافذ ہو رہے ہیں، کیونکہ اگر ہم یہ نہ مانیں تو خدا کو ماننا لازم آئے گا، اور خدا

ہی کو ہم نہیں ماننا چاہتے! قرآن اس عالم اور اس کی ایک ایک چیز میں چھپی ہوئی بے شمار حکمتوں کی طرف رہنمائی کر کے پوچھتا ہے کہ بتاؤ کائنات کے مختلف اجزاء میں یہ توافق (Harmony) کہاں سے آیا؟ اس پوری مشین کے پرزے کیونکر فٹ ہو گئے؟ اگر یہ زمین و آسمان، یہ چاند سورج، یہ بیشمار سیارے اور لاتعداد کرے بغیر کسی حکمت کے خود پیدا ہو گئے تو ان کا یہ توازن اور یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ کیسے قائم ہو گیا؟ زمین کے دامن میں یہ صلاحیت کیوں کر پیدا ہوئی کہ وہ تمہارے چلنے، پھرنے، رہنے، سہنے کی ضرورتیات کے سامنے جھکی رہے؟ مٹی کے اندر یہ استعداد کہاں سے آئی کہ آسمان کی دی ہوئی بارش کو قبول کر کے بیج کو روئیدگی بخشے؟ پانی کے مزاج میں بھاپ بن کر ہوا کے کندھوں پر اڑنے اور پھر زمین پر برسنے کی قابلیت کس طرح پیدا ہوئی؟ کیا اجزائے کائنات میں اس تاثیر و تاثر کی موجودگی، ذراتِ مادہ کا یہ باہمی تعاون ہزاروں کروں کا یہ باہمی توافق اپنے پس پشت کوئی حکیم اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہستی نہیں رکھتا؟ وار اور پھر قرآنی استدلال کا وار سخت سہی لیکن جاہلیت فوراً "اتفاقات"، اور "مادہ کے طبعی خواص" کی سپر سامنے کر دیتی ہے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو جھنجھلا کر وہی بات کہتی ہے جو چار ہزار برس پہلے کا جاہل انسان کہتا تھا کہ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً "ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ خدا کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں" یعنی وہی قدامت پرستی، وہی دقیانوسیت، وہی بوسیدہ خیالی جس پر جدید زمانہ کا انسان روزانہ ہزاروں مرتبہ تبرّی بھیجتا ہے! بات کو فلسفیانہ آب و رنگ دے کر ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا تو کیا ہوا۔ جامہ پوشی کا ڈھنگ چاہے کچھ ہو، "اندازِ قد"، تو وہی ہے۔ پہچاننے کے لئے محض تنا سا نظر کی ضرورت ہے۔ ربانی عظمت و کبریائی کے بلند تخیل سے جس طرح اگلوں کا جہالت زدہ دماغ قاصر رہا اور جس طرح ایمان لانے کے لئے دقیانوسی دور میں اس بے پایاں حقیقت کے محسوس اور مرئی ہونے کی شرط لگائی گئی، ٹھیک اسی طرح آج بھی مطالبہ ہو رہا ہے کہ جب تک انسانی تجربہ اور مشاہدہ میں کوئی چیز نہیں آتی اس پر ایمان لانا عقل کی توہین ہے حکمتِ جاہلیہ

خدا کے عدم پر سب سے بڑی دلیل جو قائم کر سکی ہے وہ یہی ہے۔
خدا کی طرح قیامت اور حشر و نشر کا نظریہ بھی اسی بنا پر ناقابل قبول ہے۔ مرنے کے بعد از سر نو جی اٹھنا اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے عرب کے وحشی بدو کی نگاہ میں جس قدر مستبعد اور حیرت خیز تھا، اس سے کہیں زیادہ محل تعجب وہ آج اس بیسویں صدی میں یورپ کے مہذب ڈاکٹر کی نگاہ میں ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جسم کے جو ذرات خاک میں مل کر خاک ہو گئے۔ ہوا کے تیز و تند جھونکوں نے جن اجزا کو مشرق و مغرب میں پھیلا دیا، وہ دوبارہ کیسے مجتمع ہو کر پھر زندہ شکل اختیار کر لیں گے؟ وہ کہتا ہے کہ مارنے اور جلانے والی کسی ہستی کا تخیل محض وہم پرستی کی ایجاد ہے، ورنہ در اصل بے جان اجزائے مادی کو نہ کوئی بیرونی طاقت ترتیب دیتی ہے نہ ان میں جان پیدا کرتی ہے۔ مادہ خود اپنے نظم میں ترقی کر کے جاندار ہیئت میں متشکل ہو جاتا ہے۔ جب یہ نظم درہم برہم ہو جائیگا تو اس کے امتزاج خاص کی طبیعت نے جو قوت حیات اور رازجی پیدا کر رکھی تھی وہ فنا ہو جائیگی اور یہ فنا اس جسم کی فنائے محض ہے۔ کوئی تجربہ یا مشاہدہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کالبد خاکی میں "روح" نام کی کوئی چیز باہر سے آتی ہے اور اس سے نکل جانے کے بعد بھی موجود رہتی ہے۔ اسی طرح کوئی مشاہدہ اس امر کا بھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص مر کر جی اٹھا ہو۔ لہذا یہ حشر و نشر، یہ عذاب و ثواب، یہ سزا و جزا سب کے سب نافہمی اور ضعف عقل کی وسوسہ آفرینیاں ہیں۔ جو چیز ہمارے تجربات اور مشاہدات کے اندر آئے وہی حقیقت ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سراسر افسانہ ہے، وہم ہے، تنگ نظری اور تاریک خیالی ہے، جنون اور عجائب پرستی ہے۔ سلسلۂ کون و فساد کو دیکھ کر ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ نظام عالم درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس امکان سے بھی انکار نہیں کہ کل کوئی کرۂ سماوی زمین سے ٹکرا جائے اور وہ پاش پاش ہو کر اپنی موجودہ ہیئت بدل دے، کیونکہ اس قسم کے حوادث کے آثار کا ہم مشاہدہ کر چکے ہیں۔ لیکن اس فنا کے

بعد کوئی بقا یا اس فساد کے بعد کوئی اور کون ہوگا، یہ چیز ہمارے محسوسات و مشاہدات کے دائرہ میں نہیں آئی ہے، پھر اسے کیوں مانیں؟

قرآن پھر اُن کی فطرت سے اپیل کرتا ہے، اس صحیفۂ کائنات کی نمایاں حکمتوں کو پڑھ کر سناتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ کیسی روشن خیالی ہے جس کی تاریکیوں میں تم کو ربانی کرشموں سے بھری ہوئی اور تمہاری آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی کائنات کے اندر کوئی نشانِ حیات بعد الموت نظر نہیں آتا؟ تم دیکھ رہے ہو کہ ہر فساد کے بعد ایک ارتقائی صورت کون وجود میں آتی ہے۔ پھر کائنات کی اس متوقع فنا کے بعد کسی اور مکمل تر صورت کے وجود پذیر ہونے میں کونسا استحالہ ہے؟ اگر مردہ زمین بارش کے قطروں سے زندہ کی جاسکتی ہے اگر بے جان مادہ میں جان ڈالی جاسکتی ہے، تو مردوں کو پھر زندہ کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ تمہیں مرکر دوبارہ زندہ ہونے پر حیرت ہے، حالانکہ اس سے بدرجہا زیادہ حیرت انگیز تو خود تمہارا عدم محض سے وجود میں آنا ہے۔ جب اتنی بڑی حیرت انگیز بات واقع ہوگئی تو اس سے کم درجہ کی بات پر تمہیں کیوں اچنبھا ہوتا ہے؟ تم نے غلط کہا کہ مرکر جی اٹھنے کا کوئی مشاہدہ آج تک نہیں ہوا۔ زندگی سے خالی مادے میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہوئے تم روز دیکھتے ہو اور پھر بھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو مادہ ایک مرتبہ آثارِ حیات قبول کرچکا ہے وہ پھر بھی انہیں قبول کرسکتا ہے۔ اور یہ کون سی عقلیت ہے کہ تم ایک طرف تو اپنے ذی عقل، ذی شعور، ذی علم ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہو کہ تمہیں کسی ایسی بے عقل، بے شعور، بے علم طاقت نے بنایا ہے جو سالہا سال تک تم سے محنت اور عمل کرانے کے بعد یونہی تمہیں اور تمہارے کاموں کو خاک میں ملادے گی؟ تم اپنی زندگی کے کسی کام کو بے مقصد، بے نتیجہ اور عبث نہیں پاتے اور نہیں سمجھتے، مگر حیف ہے تمہاری عقل پر کہ جس زندگی کا ہر ہر جزء با مقصد اور نتیجہ خیز ہے، خود وہ زندگی تمہارے نزدیک عبث ہے، بے نتیجہ ہے اور بے مقصد ہے! تمہاری عقل نے تمہیں خود اپنی نگاہوں میں کس قدر ذلیل اور بے قدر کردیا کہ تم اپنے آپ کو گھانس پھونس اور کنکر پتھر سمجھ بیٹھے!

یہ سُن کر جواب کیا ملتا ہے؟ یہی کہ نہ ہم نے اس صانعِ حکیم کو دیکھا جس کا تم حوالہ دیتے ہو، نہ اس مقصد کا ہمیں نشان ملا جس کے لئے تم کہتے ہو کہ اس نے ہمیں بنایا ہے، اور نہ ہم نے کسی مردے کو زندہ ہوتے دیکھا، اس لئے ہم ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں مانتے، کیونکہ ہم صرف انہی حقیقتوں کو مانتے ہیں جو لیبورٹری میں ناپی تولی اور محسوس کی جاسکتی ہیں۔ یہ ہے جاہلیت کی بے بصری، ایک طرف اپنی حیوانیت کا پُرفخر اعتراف، دوسری طرف حقائق کو بالمشافہ دیکھنے کا مطالبہ! سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

غور کرو خدا اور آخرت کے خلاف دلیل یہ نہیں ہے کہ ان کے عدم وجود پر دلائل کی شہادت موجود ہے، بلکہ دلیل یہ ہے کہ ہمارے حواس نے ان حقائق کو محسوس نہیں کیا۔ کتنا محکم استدلال ہے۔ اگر کل یہ بات تحقیق نہ ہوگئی ہوتی کہ فضائے کائنات میں ہزارہا اجرام تیر رہے ہیں، ہمارے نظام شمسی کے علاوہ بے شمار نظام شمسی موجود ہیں، زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے، آفتاب کی شعاعیں انرجی اگل رہی ہیں، فضائے بسیط ایک لطیف چیز سے بھری ہوئی ہے جسے ایتھر کہتے ہیں، تو آج "حقیقت پرست" جاہلیت پر یہ فرض عائد ہوجاتا کہ پورے جزم و یقین کے ساتھ ان حقائق کا انکار کردے۔ کیا غیبی حقائق کے خلاف چودہ سو برس یا چار ہزار برس پیشتر کی جاہلیت نے اس کے علاوہ کوئی اور دلیل پیش کی تھی؟ اس کی آنکھوں پر بھی تو یہی مادی پردہ تھا، اس نے بھی تو اسلامی تصورات کے قبول کرنے میں اسی تنگ دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ جاہلیتِ جدیدہ کا غلغلۂ الحاد وانکار فلک شگاف اور آفاق گیر سہی مگر بلحاظِ اصلیت وہ بھی تخمین و تخرص کی انہیں تاریک وادیوں میں بھٹک رہی ہے جو اس کے مورثِ اعلیٰ ترکہ میں چھوڑ گئے ہیں، بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ - اور اگر تم الفاظ کی مرعوبیت سے آزاد ہوکر اصل معنیٰ تک پہنچ کر دیکھو تو نظر آئے گا کہ وہی سرچشمۂ جاہلیت کا سینچا ہوا نفسانی تخم خبیث ایک جگہ شجر الحاد بن کر نمودار ہوتا ہے تو دوسری جگہ شرک کے برگ و بار نکالتا ہے، ایک جاہل اس بنا پر خدا اور آخرت کا انکار

کرتا ہے کہ اس کے نفس کو اباحت (Licentiousness.) کی سرور انگیزیوں سے بلا خوفِ انجام محظوظ ہونے کا موقع ملے، اور دوسرا صفاتِ الوہیت کو پتھر کے مجموں میں اس لئے تقسیم کر دیتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ کی بے لاگ سنتِ الٰہیہ سے دوچار نہ ہونا پڑے، رندکا رند بھی رہے اور ان بتوں کی سفارشوں کی بدولت جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ۔ حیوان دونوں ہوئے، چاہے تم ان کے نام الگ الگ ہی کیوں نہ رکھ لو۔ دونوں نفس کے پرستار، دونوں کی محسوس پرست ذہنیت ادراکِ حقیقت سے عاجز و درماندہ، یعنی دونوں کے لئے اسلامی تصورِ الوہیت اور نظریۂ آخرت غیر مانوس، اجنبی، غریب اور قابلِ حیرت و استعجاب۔

جاہلیتِ جدیدہ نے اپنے افکار و نظریات، اپنے علوم و فنون، اپنے اخلاقی تصورات اور اجتماعی اصول، اپنے قوانینِ معاشرت و تمدن، اور اپنی سیاست و معیشت کی پوری بنیاد خدا و آخرت کے انکار پر رکھی ہے، اور یہی نظامِ حیات آج تمام دنیا میں فوجی طاقت، معاشی تسلط اور تعلیم کے زور سے پھیلا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں وہ نظامِ حیات اپنی بنیاد سے لیکر اپنے اجزا تک کیسر غریب ہو کر کیسے نہ رہ جائے جس کی اساس ہی خدا اور آخرت کے عقیدہ پر رکھی گئی ہے؟ جاہلیت جتنی سخت آج ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اس لئے اسلام جتنا غریب آج ہے، اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ دونوں تہذیبوں میں بعد المشرقین ہے۔ اسلامی تہذیب بنی آدم سے گذر کر زمین و آسمان، ثوابت و سیارات، آفتاب و ماہتاب، ابر و باد، شجر و حجر، چرند و پرند یعنی موجوداتِ ہستی کے ایک ایک ذرہ کو مسلم اور ایک عالمگیر مذہب کا پیرو بتاتی ہے لیکن تہذیبِ نو یا تو سرے سے مذہب کا نام ہی نہیں سننا چاہتی اور اگر کچھ رعایت سے کام لیتی ہے تو اسے عبادت گاہ کی چہار دیواریوں میں محصور کر کے حکم دیتی ہے کہ خبردار اس احاطہ سے باہر آواز نہ نکلنے پائے، دنیا کے کسی معاملہ سے تیرا کام نہیں، زندگی کے تمام شعبے تیری مداخلت سے آزاد ہیں، ایک مکمل دستورِ حیات کی حیثیت سے تجھے پوری دنیا پر حکمرانی کرنے کا مجاز نہیں، یہ حق محض معدہ

اور نفس کو حاصل ہے۔ تیری حیثیت محض ایک شخصی اعتقاد کی حد تک گوارا کی جا سکتی ہے۔ عملی زندگی یا اجتماعی معاملات سے تجھے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

زبان تجدد نے یہ فتویٰ غریب مذہب کو سنا تو دیا اور مادی اغراض کے اشارے پر اس نے "علم و سائنس" کی روشنی میں اپنا ایک نظام حیات بھی بنا لیا۔ لیکن باطل کوشی کے ہلاک نتائج جب سامنے آئے تو اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے معلوم ہوا کہ جس چیز کو وہ روشنی سمجھ رہا تھا وہ ایک ہیبتناک تاریکی تھی، اور جس طرف آب حیواں سمجھ کر وہ لپکا تھا وہاں سراب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس تلخ تجربہ نے اسے مذہب کو پھر یاد دلایا اور اس نے ایک ایسے مذہب کی ضرورت محسوس کی جو اپنے اندر ہمہ گیری اور کلیت کی شان رکھتا ہو، اجتماعیت کا رہنما ہو، میدانِ زندگی کے ہر گوشہ میں مشعل کیف ہو، انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے امراض کا چارہ ساز ہو، حریت فکر اور روح تحقیق کا علمبردار ہو، قوانینِ فطرت سے ہم آہنگ ہو اور دنیوی کامرانیوں اور دینی ارجمندیوں کا نقیب ہو۔ لیکن چونکہ موجودہ مذاہب عالم سے اسے ایک موروثی بغض اور غلط فہمی ہے اس وجہ سے اس کا خیال ہے کہ یہ سارے مذاہب مروجہ ناقص ہیں، اور ان مذکورہ بالا اوصاف کا کوئی حامل نہیں۔ اس نظریہ کی بنا پر اس نے ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کی ٹھانی ہے جس کا نام وہ "دینِ فطرت" رکھتا ہے۔ وادی اضطراب میں وہ یوں سرگرداں پھر رہا ہے مگر جاہلیت کی کیسی کامل ساحری ہے کہ اس کی آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا کہ جس حقیقتِ حیات کے لئے وہ تڑپ رہا ہے وہ صدیوں سے قرآن کے سینے میں محفوظ ہے۔ اس سے بڑھ کر اسلام کی غرابت اور اجنبیت کا منحوس دور اور کونسا ہو سکتا ہے؟ -

کلیسا سے نکل کر ہندی بت خانوں میں آؤ اور اس کے مہاتماؤں اور شری بتوں کے سامنے مذہب کے اس اسلامی تخیل کی وسعت، عظمت اور ہمہ گیری پیش کر کے ان کی پیشانیوں کو دیکھو کہ حیرت

اور اجنبیت کے شدید احساس سے کس طرح تسکین آلود ہو جاتی ہیں - ایک شخصیت جو اپنی آمدنی پر سالانہ بیس ہزار روپیہ ٹیکس کے ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی پینتیس کروڑ فاقہ مست ہندوستانی جنتا کے پینتیس کروڑ معدوں کی بھوک پیاس اپنے صرف ایک معدہ میں محسوس کر کے بے تاب ہوئے جارہے ہیں بعض "مذہبی مجنونوں" کے اس مطالبہ پر کہ مسلمانوں کے تمام اجتماعی مسائل اسلامی نظریات کے مطابق حل ہونے چاہئیں، چین بجبیں ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں تو جنتا کی بھوک، بیکاری اور جہالت کو دور کرنا چاہتا ہوں یہاں ہندو مت اور مسلم مت کا کیا سوال؟ مذہب کو لئے تم مسجدوں اور مندروں میں بیٹھے رہو، اس کا تعلق تو محض انفرادی عقائد اور معاملات تک ہی، اجتماعی مسائل اور عملی میدان میں تم اس سنگ گراں کو لائے اور آزادی کا نازک آبگینہ چور چور ہوا - مذہب کے دامن کو اتنا نہ پھیلاؤ کہ وہ خانقاہوں کی خاموش فضا سے نکل کر جیل کی شورشوں تک پہنچ جائے، وہی اپنے ہاتھ سے روٹی بانٹے، وہی اپنے حکم سے پارٹی بنائے، وہی الیکشن لڑائے اور وہی اسمبلی ہال میں تقریر بھی کرائے - یہ عجیب مذہبیت ہے! میں نے تو اجودھیا سے ماسکو تک چھان مارا ہے، کسی روشن دماغ اور وقت شناس کے نزدیک یہ درخورِ اعتنا نہیں پایا۔

شاید تم کہو کہ اس ریمارک میں تو الحاد کی بو آتی ہے - الحاد بے چارہ مذہب کو کیا سمجھے - ہاں جو مذہب اور خدا کو مانتا ہوگا وہ اسلام کے اس تصور سے کہ مذہب ایک خدائی ضابطۂ زندگی ہے جو ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہے، یقیناً بیگانہ نہ ہوگا - اچھا چلو کسی ایسے مذہب پرست، خدا رسیدہ کو تلاش کرو جو مہاتما بھی ہو، بھگت بھی ہو، اسے "خدا کی روشنی" بھی ملی ہوئی ہو اور شاید کرشن جی کا اوتار بھی تسلیم کیا جاتا ہو یا کیا جانے والا ہو اور اس سے اس نظریہ کے متعلق یہ سن لو کہ تمام مذاہب سچے ہیں، مذہب چند عالمگیر صداقتوں کا نام ہے، مجھے اسلام کے نظریہ کے متعلق بڑا الجھن تھا لیکن اب مولانا . . . . . کی تفسیر سے تسلی ہو گئی کہ وہ بھی ہر انسان کو ایک خاص ضابطہ اور ہمہ گیر قانون کا پابند نہیں بناتا۔ مفکرین ہند کے وہ روشن ضمیر جن کی "ہر بات ٹھیک ہوتی ہے" اسلام کو جس قدر سمجھتے ہیں اب تم خود فیصلہ کر لو۔

رہ گیا اسلام کا تصورِ خلافت سو اس کی اخلاقی عظمت اور عقلیت بندگانِ جہل کے احاطۂ تصور میں کیوں کر آئے۔ اسلام تمام بنی نوع انسان کو خدا کی رعایا اور صرف ایک خدا کو حاکم علی الاطلاق مانتا ہے۔ اس کے وضع کردہ قوانین کا نفاذ کرنے والا ہی اس کا نائب اور خلیفہ ہو سکتا ہے جس کا فرض ہو کہ بغیر انسانی رایوں کی آمیزش کے ان قوانین کو نافذ کرے، خدا کی زمین سے شر و فساد کا استیصال کرے اور عدل و خیر کی برکتوں سے دامنِ ارض بھر دے۔ اس کا انتخاب تو چہرہ کا رنگ کر سکتا ہے، نہ نسل کا امتیاز۔ استحقاقِ خلافت نہ قومیت ثابت کر سکتی ہے نہ وطنیت۔ یہ خدا کی ایک مقدس امانت ہے اس کا نشیمن صرف ایک مقدس دل ہی ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کہیں زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ سب کچھ سن کر جاہلیت ایک حقارت آمیز قہقہہ لگاتی اور نگاہِ حیرت سے گھورنے لگتی ہے۔ اس کا ذوقِ روشن خیالی ایسے نامعقول اور دقیانوسی تصور سے چیں بجبیں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خدائے وطن کی اس تحقیر کو گوارا نہیں کر سکتی۔ پہاڑ کی دیواروں اور پانی کے دھاروں سے تقسیمِ انسانیت کے حقوق سلب کر لینا اس کے نزدیک ظلم ہے۔ کوئی اپنے وقت کا فاروقؓ اور صدیقؓ ہی سہی لیکن اگر اس کے پاس نسل کا پروانہ نہیں، وطنیت کا ٹکٹ نہیں، قومیت کی سند نہیں تو کسی حق کا مستحق نہیں۔ خلافت اور حکومت تو بڑی چیز ہے عام شہری حقوق کا بھی حقدار نہیں۔ جغرافیائی حدود یا نسلی امتیازات، اقوام و اوطان بنانے والے ہیں، اقوام و اوطان مجالس آئین ساز منتخب کرنے والی ہیں، اور یہ مجالس قوانین وضع کرنے والی ہیں۔ ایک قوم اگر دوسری قوم پر حکومت کر بھی سکتی ہے تو اس لئے نہیں کہ محکوم قوم میں عدل کو زندہ کرے گی، قانونِ الٰہی کو نافذ کرے گی، بھٹکی ہوئی انسانیت کو سچائی اور ہدایت کی روشنی دکھائے گی بلکہ اس لئے کہ وہ سفید فام ہے اور دوسری سیاہ رنگ، یا وہ آریہ نسل سے ہے اور دوسری غیر آرین، یا اس کے ہاتھ میں ہٹلری گرز ہے اور دوسری بے دست و پا ہے۔ چنانچہ جاہلیت کے جدید علمبرداروں نے حق و صداقت کے اس فرعونی تخیل کی شہادت اپنے عمل سے بھی پیش کر دی اور قول سے بھی۔ ابھی کل کی بات ہے جب ہندوستان نے انگریزوں سے للکار کر کہا کہ دیکھو ہمالیہ اور بحرِ عرب ہندوستانی

حرم کی فصیلیں ہیں، ان کی حرمت کا لحاظ کرکے یہاں سے نکل جاؤ، تو برطانی دار القضا سے پہلے شلر نے فتویٰ دیا "ہرگز نہیں، کالے ہندوستانیوں پر سفید فام اقوام کو حکومت کا فطری حق حاصل ہے"، لیکن اس ہنگامۂ سوال و جواب میں اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کے ضابطہ کو ہر ایک نے ناقابل اعتنا سمجھا۔ اسی طرح چند سال پیشتر جب امتِ اسلامی کی پراگندہ بھیڑوں کو یورپین بھیڑیوں نے چن چن کر پھاڑنا شروع کیا اور غافل مسلمانوں میں روح خلافت کی ربانی طاقتوں کا دوبارہ احساس پیدا ہوا تو مہذب جاہلیت نے اس کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا اور اسے "پان اسلامزم" کا ہوّا بنا کر امنِ عالم کی برقراری کے لئے دعائیں کرنے لگی۔ حالانکہ وہ اسلامی خلافت کا محض ایک ہلکا سایہ تو تھا مگر جاہلیت اس کے اتنے سے فروغ کو بھی کیوں برداشت کرتی۔ آخر اس نے اس "خطرہ" کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور اسلامی خلافت کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھڑک کر بالکل خاموش ہو گیا۔

گو مسلمانوں کی موجودہ عملی سیاست میں اس الٰہی خلافت کے آثار مفقود ہیں اور شاید مدعیانِ اسلام کے دماغوں میں بھی اس کا کوئی نقش تمنا موجود نہیں مگر اس کا مجموعۂ قوانین یعنی قرآن ابھی موجود ہے جو زمانہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے اور اگر بس چلے تو طوفانِ جہل انسانی دماغوں سے مٹانے کے بعد ان نقوشِ ہدایت کو کاغذ کے صفحوں سے بھی دھو ڈالے۔ ابھی اُس نادان فرنگی کی اس تقریر کی صدائے بازگشت تمھارے کانوں میں گونج رہی ہوگی جس میں اس نے برطانی پارلیمنٹ کے سامنے قرآن ہاتھ میں لیکر کہا تھا کہ "جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے کبھی امن نہیں قائم ہو سکتا"۔

تمھیں حیرت نہ ہو کہ ایک ایسی کتاب کے بارے میں جو عدل کی میزان ہو، اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً کی داعی ہو، وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کی معلم ہو، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى کی معلن ہو، یہ رائے کیونکر قائم کی جا سکتی ہے جو دانش فروشانِ فرنگ نے قائم کی ہے کہ یہاں تو صلاح و فساد کا معیار

ہی اور یہی آنکھ کا اندھا شب و روز کو یکساں تاریک پاتا ہے، لیکن دل کا اندھا صرف دن کو تاریک دیکھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شبِ تار کی نورانیت کا پر جوش عقیدت مند بھی ہوتا ہے۔ یہ مملکتِ جہل کا اساسی دستور ہے، یہاں عالم الغیب والشہادہ کا بنایا ہوا قانون موجب فساد اور کوتہ نظر و ظاہر بین انسانوں کا وضع کیا ہوا قانون امن و صلح کا ضامن مانا جاتا ہے۔ پھر یہ تخیل کوئی نیا تخیل نہیں ہے۔ دنیا ہمیشہ سے حیوانی بوالعجبیوں کا گہوارہ رہی ہے۔ عرب کے منافقین نے بھی تو کچھ اسی تخیل کے ماتحت ــــ جب انہیں غیر آسمانی قوانین کے نتیجۂ اتباع یعنی افساد فی الارض سے روکا گیا ــــ کہا تھا کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ پھر آج یہی بات کو انہیں کے بھائی بندوں سے سن کر ہمیں تعجب کیوں ہو یہ تو قَدْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ کی خارجی تفسیر ہے۔ جو باتیں پہلے دلوں سے نکلی تھیں وہی اب بھی نکل رہی ہیں۔ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ جہالت کا بیج جس زمین میں بویا جائے گا ایک ہی سا پھل لائے گا، اس میں مشرق و مغرب کے بُعد و دوری کے اختلاف کا کیا سوال۔ وَكَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ کی سنت عامہ کا نفاذ زمانی و مکانی حدود سے آزاد ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

نماز میں آلۂ مکبّر الصّوت کا استعمال

پنجاب کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان نے دریافت کیا ہے کہ نماز میں آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں:

یہاں عید الفطر کے موقع پر عید گاہ کے منتظم حضرات نے لاؤڈ اسپیکر نصب کرایا تھا۔ نماز کے بعد مقامی علماء نے اس کی مخالفت شروع کی اور باہر سے فتویٰ حاصل کر کے عوام سے کہا کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں۔ اب عوام پریشان ہیں، اور منتظمینِ عید گاہ خائف ہیں کہ اگر ہم نے اس دفعہ پھر لاؤڈ اسپیکر نصب کرایا تو عوام ہم سے برگشتہ ہو جائیں گے اور علماء ہمارے خلاف الحاد کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ پچھلی دفعہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ امام کی آواز تمام مقتدیوں تک صاف طور پر پہنچتی تھی اور نماز میں باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بدنظمی کی یہ حالت ہوتی تھی کہ صفوں میں انتشار رہتا تھا۔ کوئی مقتدی رکوع میں ہوتا تھا اور کوئی سجود میں۔

مقامی علماء سے عدمِ جواز کے دلائل پوچھے گئے تو انھوں نے دو باتیں بیان کیں:

(۱) لاؤڈ اسپیکر کا استعمال داخلِ لہو و لعب ہے۔

(۲) فقہ حنفی کی رو سے غیر امام کی آواز پر اگر مقتدی کسی قسم کی حرکت کرے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔

لیکن ان دلائل سے ہمارا اطمینان نہیں ہوتا۔ پہلی بات تو دلیل نہیں بلکہ خود ایک دعویٰ بلا دلیل۔

دوسری بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات لاؤڈ اسپیکر کے اصولِ ساخت سے ہی واقف نہیں۔ اس آلہ کے ذریعہ سے نشر شدہ آواز کو غیر امام کی آواز کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ علماء کی ایسی بودی اور کمزور باتوں سے تعلیم یافتہ طبقہ سخت بددل ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پیشوایانِ دین ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کو بھی اسی بغاوت پر مجبور کرنا چاہتے ہیں جس پر اتاترک اور رضا شاہ مجبور ہوئے۔ لیکن کیا اس ردعمل میں ہمارے لئے صحیح اسلام سے بھی اسی طرح دور جا پڑنے کا خطرہ نہیں جس طرح یہ دو فرمانروایانِ اسلام صراطِ مستقیم سے بھٹک کر ثابت کر چکے ہیں۔

اس معاملہ میں ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے کہ ہمیں آپ کی بصیرت اور اجتہاد پر پورا اعتماد ہے۔ اگر آپ ایسے بڑے مجمعوں میں نماز پڑھانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں تو تفصیلاً اس کے دلائل تحریر فرمائیں تاکہ ہم علمائے کرام کی تشفی کر سکیں۔ اور اگر آپ کے خیال میں کچھ ایسے مصالح دینی ہیں جن کے پیشِ نظر اس کا استعمال خلافِ احتیاط ہو تو بھی ہمیں اس کے متعلق واضح طور پر لکھیں تاکہ نوجوانوں کو سمجھایا جاسکے۔"

یہ استفسار بتمام و کمال اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ علمائے اسلام وقت کے رجحانات کو سمجھیں اور غور فرمائیں کہ جس دور میں وہ رہتے ہیں وہ کس طرز پر مذہبی رہنمائی کا طالب ہے، اور اس دور میں دو سو برس پرانے طریقِ رہنمائی کو اختیار کرنے کے نتائج کیا ہیں۔ اب سے دو تین سال قبل حیدرآباد میں بھی ایسی ہی صورت پیش آئی تھی۔ عید گاہ میں لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا، لوگوں نے بہت اچھی طرح نماز ادا کی، اور ہر شخص اس سے مطمئن تھا، مگر بعد میں علماء نے مخالفت کی، کمیٹیاں ہوئیں، مشورے ہوئے، اور آخر کار فیصلہ کر دیا گیا کہ نماز میں اس آلہ کا استعمال ناجائز ہے۔ میں اس وقت حیدرآباد ہی میں تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا کتنا برا اثر تعلیم یافتہ طبقہ پر ہوا اور کیا خیالات علماء کے متعلق ظاہر کئے گئے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو احکامِ دین کو اس تعلیم یافتہ اور نو تعلیم یافتہ

طبقہ کی اہواء کا تابع بنانا چاہتے ہیں، اور اسی کو روشن خیالی سمجھتے ہیں۔ اگر میں یہ دعوی کروں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اس گروہ کے غیر اسلامی رجحانات کے خلاف جہاد کرنے میں میرا قدم کسی متشدد سے متشدد عالم دین سے بھی پیچھے نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس بات کا بھی سخت مخالف ہوں کہ علماء کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں، اور اس امر کو بالکل بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانۂ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئی سائنٹفک ایجادات، اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں۔ اس دور میں روز بروز نئے مسائل کا پیدا ہونا لابد ہے، اور ان مسائل کو ہدایہ و بدائع کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں، جس کا خطرہ نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں ظاہر کیا ہے۔ ہماری نئی نسلیں شدت کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہو رہی ہیں، اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ زمانہ اپنی طبعی رفتار سے جو حالات اور جو مسائل پیدا کر دے ان سے وہ قوم یکسر بے تعلق ہو کر رہے جو کروروں کی تعداد میں دنیا کے ہر حصہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان نئی نسلوں میں اگر کوئی غیر اسلامی رجحان پیدا ہو تو اس کو روکنے کے لئے علماء اسلام کے پاس وہ طاقت ور دلائل چاہئیں جو اس زمانہ کے دماغوں سے اپنا لوہا منوا سکتے ہوں۔ چھٹی صدی ہجری کی منطق اب کام نہیں دے سکتی۔ اور اگر یہ لوگ جدید تمدنی زندگی میں اسلام کی شاہراہ پر آگے بڑھنا چاہیں تو ان کی رہنمائی کے لئے علماء اسلام میں وسعتِ نظر اور روحِ اجتہاد کی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لا کر سدِ راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانہ کے مسلمان قرآن اور حدیث کو بھی پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے گا چل نکلیں گے، جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے۔

مسئلہ زیر بحث کا جواب چند الفاظ میں دیا جا سکتا ہے لیکن اس سے پہلے میں چند اصول بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اسی نوعیت کے دوسرے مسائل میں بھی شریعت کا حکم آسانی کے ساتھ معلوم کیا جا سکے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جزئیات کے متعلق صریح شرعی احکام ہم کو صرف انہی حوادث اور انہی امور کے متعلق معلوم ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیش آئے تھے۔ باقی رہے

وہ حوادث جو حضورؐ کے بعد پیش آئے، تو ان کے متعلق شرع میں کوئی صریح حکم نہیں مل سکتا، بلکہ صرف اصول وکلیاتِ شرع ہی سے نکالا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ مجتہدین نے بعد کے حوادث پر جتنے شرعی احکام لگائے ہیں وہ اسی طرح اصول وکلیات سے اخذ کئے ہوئے ہیں، نہ کہ منصوص۔ اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اس دور میں موجود ہی نہ تھی، تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثہ اور ایسی ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول وکلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہ اور ائمہ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔

(۲) کسی نو ایجاد چیز کے استعمال کو مکروہ یا ناجائز ٹھیرانے کے لئے محض یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ عہدِ رسالت میں یا عہدِ صحابہ میں، یا عہدِ ائمہ میں موجود نہ تھی۔ تنزیلِ شرائع سے اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ انسان کی قوتِ ایجاد ایک خاص دور کے بعد ختم ہو جائے، اور اسبابِ عالم کی تلاش وجستجو اور ان سے کام لینے کے نئے نئے طریقوں کی دریافت کا سلسلہ ایک خاص زمانہ تک تو جائز ہو اور اس کے بعد حرام قرار دیدیا جائے۔ جو لوگ سنت اور بدعت کی تعبیر اس طرح پر کرتے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑا ظلم کرتے ہیں، کیونکہ وہ دشمنانِ اسلام کے اس الزام کی تصدیق ہے کہ اسلام کوئی دائمی مذہب نہیں بلکہ ایک خاص زمانہ کے لئے آیا تھا اور اب اس کے اتباع سے انسانی تمدن کے نشو وارتقاء کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

(۳) تنزیلِ شرائع سے اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد انسان کو وہ اصول سکھانا ہے جن کے تحت وہ اسبابِ عالم سے غلط کام لینے کے بجائے صحیح کام لے سکے، اور ان کو مضرت کے بجائے حقیقی منفعت اور سچی فلاح کے لئے استعمال کرے۔ ان اصولوں کی محض لفظی تعلیم ہی ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں دی گئی ہے، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جن اسبابِ عالم پر انسان کو دسترس حاصل تھی، انہیں اسلامی طریق پر برت کر بھی ہم کو بتا دیا گیا ہے کہ آئندہ جن اسباب پر دسترس حاصل ہو انہیں اس طور پر اور ان مقاصد کے لئے استعمال

کرنا چاہئیے۔ صحابہ کرام اور ائمہ سلف نے اصولِ شرع کو اسی اسپرٹ میں سمجھا اور تمدن کی ترقی کے ساتھ سامنے آنے والے
نئے حوادث اور نئی اشیاء پر اصولِ اسلام کو منطبق کر کے انھوں نے شرع کی ہدایت کو ہمارے لئے اور زیادہ
روشن کر دیا۔ اب اگر ہم ان اصولوں کو سمجھ جائیں تو قوائے فطرت میں سے جو نئی قوت ہمارے علم میں آئیگی
اور اسبابِ کائنات میں سے جس نئے سبب پر ہمیں دسترس حاصل ہوگی اس کے معاملہ میں ہم کو ہرگز کوئی
حیرانی و سرگردانی پیش نہ آئے گی۔ ہم نہ تو اس اجنبی چیز سے اُپرائیں گے اور نہ اس کے سامنے ٹھٹک کر کھڑے
ہو جائیں گے، بلکہ اصولِ شرع میں تدبر کر کے بلا تکلف یہ معلوم کر لیں گے کہ اس کو استعمال کیا جائے یا نہ کیا
جائے اور اگر استعمال کیا جائے تو استعمال کا پسندیدہ طریقہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے، اور ناپسندیدہ
طریقہ کونسا ہے۔ ہر نئی چیز سے اُپرانے اور تمدن کی ترقی کے راستہ میں ہر ہر قدم پر ٹھٹک کر کھڑے ہو جانے
کی کیفیت جو آجکل پیش آرہی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شرع کے اصول و کلیات کو سمجھنے کے بجائے
ہمارے علماء زیادہ تر فقہی جزئیات کے استقصاء میں منہمک رہتے ہیں۔

(۴) قرآن و حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے تاوقتیکہ عدمِ اباحت
پر کوئی دلیل نہ ہو یعنی ہر چیز کو پاک، حلال اور مباح سمجھا جائے گا جب تک کہ اس کے نجس یا حرام ہونے
پر کوئی دلیل نہ لائی جائے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا — وہی ہے جس نے تمھارے لئے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ — اور اس نے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں تمھارے لئے مسخر کیا۔

ان دونوں آیتوں سے ظاہر ہے کہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں، لہذا انسان
ان سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے کا مستحق ہے۔ ایک ایک چیز کے لئے الگ الگ اجازت کی ضرورت نہیں،

بلکہ جب تک کسی خاص چیز کے استعمال یا طریقِ استعمال کی ممانعت نہ ہو، سب چیزوں کو مباح اور طاہر ہی سمجھا جائے گا۔ اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمانؓ فارسی سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ	حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کر دیا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا تو وہ معاف ہیں۔

(۵) اشیاء کی حرمت اور حلّت کے احکام جس قاعدے پر مبنی ہیں اس کی تصریح بھی قرآن میں کر دی گئی ہے، یعنی

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ	ہمارا نبی ان کے لئے مفید چیزیں حلال کرتا ہے اور مضر چیزیں حرام کرتا ہے۔

اور اسی کی تفسیر حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ لاضرر ولاضرار فی الاسلام۔ لہٰذا جن چیزوں کی حرمت کا صریح حکم نہیں ہے ان کے حق میں اس قاعدۂ کلیہ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا کہ آیا وہ انسان کے لئے مضرت رساں ہیں یا منفعت بخش۔ اگر مضرت ثابت ہو تو وہ حرام ہیں اور منفعت ثابت ہو تو حلال۔ اسی طرح ان کے طریقہائے استعمال کو بھی اسی قاعدہ کے لحاظ سے جانچا جائے گا۔ جو طریقِ استعمال موجب فساد ہو وہ ممنوع ہے اور جو طریقِ استعمال موجبِ صلاح ہو وہ مباح ہے۔

(۶) منفعت اور مضرت، صلاح اور فساد کے بارے میں بھی شارع نے ہم کو ایک معیار دیا ہے۔ ہم اندھیرے میں نہیں چھوڑے گئے ہیں کہ جس چیز کو چاہیں مفید اور جس کو چاہیں مضر ٹھیرالیں۔ بلکہ ہمیں چند اصول بتائے گئے ہیں جن کے لحاظ سے فائدے اور مضرت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ انہی اصولوں میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ جو چیز فرائضِ دینی کی بجا آوری میں مانع ہو وہ مضر ہے

اس لئے اس سے اجتناب کرنا چاہئے، اور جو چیز اس میں مددگار ہو وہ مفید ہے اس لئے اس کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ مثلاً رویتِ ہلال میں اگر برہنہ آنکھ کی بہ نسبت دوربین کے استعمال سے زیادہ سہولت پیدا ہوتی ہے تو اسے مستحسن سمجھنا چاہئے۔ رمضان میں سحر کا آخری وقت معلوم کرنے کے لئے، اور روزمرہ نماز کے اوقات متعین کرنے کے لئے گھڑی زیادہ مددگار ہوتی ہے تو اس کا استعمال بھی مستحسن ہونا چاہئے۔ سفرِ حج کے لئے اونٹ کی بہ نسبت موٹر یا ہوائی جہاز سے زیادہ سہولت پیدا ہوتی ہے تو اس کا استحسان بھی ناقابلِ انکار ہے۔ فریضۂ جہاد کی بجا آوری میں نیزہ و شمشیر اور اسپ و فیل کی بہ نسبت بندوق، توپ، جنگی جہاز اور ہوائی جہاز زیادہ کارآمد ہیں تو ان کے مستحسن ہونے میں بھی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ان چیزوں کے حق میں حرمت یا کراہت یا توقف کا مسلک اختیار کرتا ہے، محض اس لئے کہ زمانۂ سلف میں یہ چیزیں استعمال نہیں ہوئیں، تو وہ روحِ شرع سے قطعاً بے بہرہ ہے۔

(۷) جو چیز کسی ایسے مقصد کے لئے بنائی گئی ہو جسے شرع نے حرام قرار دیا ہے اور اس امرِ ممنوع کے سوا اس چیز کا کوئی اور استعمال بھی نہ ہو تو اس کے مطلقاً ممنوع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مگر جو چیز اچھے اور برے، مفید اور مضر دونوں طرح کے کاموں کے لئے آلہ کے طور پر کام آتی ہو، اس کو محض اس بنا پر حرام نہیں کہا جا سکتا کہ فاسقین کے ہاتھوں میں اس کا غالب استعمال ممنوعات کے لئے ہے۔ مثلاً گراموفون محض ایک آلہ ہے جس کو اچھے اور برے دونوں مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہم نفس گراموفون کو حرام نہیں کہہ سکتے، بلکہ حرمت کا حکم صرف اس طریقِ استعمال سے متعلق ہوگا جو شہوات کو بھڑکانے والا اور فواحش کی اشاعت کرنے والا ہے۔

اصولِ مذکورۂ بالا کو سامنے رکھ کر جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ لاؤڈ اسپیکر کے متعلق شرع کا حکم کیا ہے تو کوئی امر ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنے سے نہیں روکتا کہ اس آلہ کا استعمال مطلقاً مباح ہے، اور نماز میں اس کا استعمال مستحسن ہے۔ یہ اُن اسبابِ عالم میں سے ایک سبب ہے جنھیں خدا نے ہمارے لئے پیدا کیا ہے،

اس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ قدرتی طور پر جو آواز نکلتی ہے، یہ آلہ اسی آواز کو لے کر زیادہ بلند کر دیتا ہے۔
چونکہ اس پر حال ہی میں ہم کو دسترس حاصل ہوئی ہے اس لئے خاص اس کے متعلق کوئی حکم سنت یا اجتہادات متقدمین میں تلاش کرنا اصلاً غلط ہے، البتہ شرع نے جو اصول ہم کو کسی چیز کی اباحت یا حرمت معلوم کرنے کے لئے دیئے ہیں ان کے لحاظ سے اس کے مطلقاً مباح ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ رہے اس کے استعمالات، تو باطل کی آواز بلند کرنے اور فواحش کا بول بالا کرنے میں اس کا استعمال حرام ہے۔ جائز آوازوں کے بلند کرنے میں اس کا استعمال جائز ہے۔ اور خدا کا نام بلند کرنے میں خدا ہی کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے کام لینا بالیقین مستحسن ہے۔ یہ بالکل ہی ایک عجیب بات ہوگی کہ کفار تو خدا کے مسخر کئے ہوئے اس خادم سے باطل کا آوازہ بلند کرائیں، اور ہم حق کا آوازہ بلند کرنے کے لئے اس سے خدمت لینے میں تامل کریں۔

اب صرف ایک شک باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ نماز میں امام کے سوا کسی اور کی آواز پر مقتدیوں کا حرکت کرنا مفسدِ صلوٰۃ ہے لہٰذا اگر لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر مقتدی رکوع و سجود کریں گے تو ان کی نماز نہ ہوگی۔ لیکن یہ شک متعدد حیثیات سے غلط ہے۔

اولاً، لاؤڈ اسپیکر سے جو آواز نکلتی ہے وہ غیر امام کی آواز نہیں ہے بلکہ بعینہٖ وہی آواز ہے جو امام کے منہ سے نکلتی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بجلی کی طاقت سے وہ زیادہ بلند ہو جاتی ہے، اور اس لحاظ سے اس کی حیثیت قریب قریب اس گونج کی سی ہے جو مسجد کی محراب سے امام کی آواز پر بلند ہوتی ہے۔

ثانیاً، اصولِ فقہ کا متفقہ مسئلہ ہے کہ التابع تابعٌ، یعنی جو حکم متبوع کا ہے وہی تابع کا ہے۔ اسی قاعدہ کی بنا پر بڑی جماعتوں میں جو مکبّر کھڑے کئے جاتے ہیں ان کی آواز پر رکوع و سجود و قیام و قعود کرنا مقتدیوں کے لئے جائز ہے، کیونکہ اگرچہ وہ غیر امام ہیں، مگر امام کے تابع ہیں، اس لئے ان کی آواز کا حکم امام کی آواز کا حکم ہے۔ پس اگر لاؤڈ اسپیکر کی آواز غیر امام کی آواز بھی ہے تب بھی وہ

تابعِ امام ہونے کی حیثیت سے اُس مقتدی کی مانند ہے جو صفوں کے درمیان تکبیر بلند کرنے کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔ بلکہ جب ہم زیادہ غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تابعِ امام ہونے میں یہ آلہ مقتدی سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ مقتدی تو خود بھی آواز نکالنے پر قادر ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر جماعت میں کوئی منافق موجود ہو تو وہ امام کے خلاف تکبیریں بلند کرکے ہزاروں آدمیوں کی نمازیں خراب کرسکتا ہے۔ لیکن لاؤڈ اسپیکر اس قدر کامل طور پر امام کا تابع ہے کہ جب تک امام نہ بولے گا وہ بھی نہ بولے گا، جو آواز امام کی زبان سے نکلے گی ٹھیک ٹھیک وہی آواز بلا ادنیٰ تغیر اس سے بھی بلند ہوگی، حتیٰ کہ امام کا لہجہ اور اس کا تلفظ تک جوں کا توں منتقل ہوگا اور جو شخص امام کی آواز پہچانتا ہو وہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز سن کر پہچان لے گا کہ یہ امام ہی کی آواز ہے۔ اتنے کمال درجہ کے تابع کا حکم متبوع کے حکم سے مختلف کیسے ہوسکتا ہے؟

اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مکبّر نماز میں شریک ہوتا ہے لیکن آلہ مکبر الصوت شریکِ نماز نہیں ہوتا، تو ہم صرف یہ آیت یاد دلائیں گے کہ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ قرآن کی رو سے تو مسلمان جب نماز پڑھتا ہے تو وہ تنہا نہیں پڑھتا بلکہ ساری کائنات اس کے ساتھ شریکِ نماز ہوتی ہے اگرچہ ناواقفانِ راز اِن غیر ناطق اشیاء کی نماز کو سمجھ نہیں سکتے۔

ثالثًا، اگر کوئی شخص اس جگہ آیت مذکورۃ الصدر کے اطلاق کو تسلیم نہ کرے اور آلہ مکبر الصوت کو خارج از صلوٰۃ قرار دے کر اس کو تابعِ امام نہ مانے تو ہم کہیں گے کہ نماز میں غیر امام کی آواز پر حرکت کرنا مطلقًا مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

(۱) اگر آدمی نماز میں ہو اور کوئی سلام کرے تو اشارے سے جواب دینا مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ ترمذی میں حضرت بلال سے اور نسائی میں حضرت صہیب سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ نماز میں سلام کیا جاتا تو آپ ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے تھے۔

(۲) نماز میں اگر کسی شخص سے کسی ضروری بات کے متعلق سوال کیا جائے تو اشارے سے جواب

دینا بھی مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ چنانچہ خلاصہ میں ہے کہ مصلّی کو سلام کیا جائے اور وہ ہاتھ یا سر کے اشارے سے جواب دے دے، یا اسے کسی چیز کی خبر دی جائے اور وہ سر کی حرکت سے ہاں یا نہیں کا اشارہ کردے، یا اس سے پوچھا جائے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اور وہ انگلیوں کے اشارہ سے بتادے تو یہ مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ (فتح القدیر۔ جلد اوّل صفحہ ۲۹۲)

(۳) اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی اسے پکارے اور وہ اس کو یہ بتانے کے لئے کہ میں نماز میں ہوں زور سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہدے تو اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی۔ (ہدایہ۔ باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ فیھا)

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جب کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز مختصر کردیتے تھے تاکہ بچے کی ماں اگر شریکِ جماعت ہو تو وہ پریشان نہ ہونے پائے۔ (بخاری اور مسلم میں اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں)

(۵) حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض سخت ہوگیا تو آپ کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھانے لگے۔ ایک روز حضورؐ نے مرض میں کمی محسوس فرمائی اور نماز میں شریک ہونے کے لئے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب آپ کے آنے کی آہٹ پائی تو پیچھے ہٹنے لگے، مگر آپ نے اشارہ سے ان کو منع کیا چنانچہ وہ اپنی جگہ کھڑے رہے اور آنحضرت ان کی بائیں جانب جا کر بیٹھ گئے (متفق علیہ)

(۶) مسجد قبا میں لوگ نماز پڑھ رہے تھے کہ تحویل قبلہ کی منادی ان کے کانوں میں پہنچی اور انھوں نے اسی حالت میں اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ پسند فرمایا۔ اسی سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص سمتِ قبلہ سے ناواقف ہو اور گمان غالب کی بنا پر کسی رخ پر نماز پڑھ رہا ہو، پھر اسی حالت میں کوئی اسے قبلہ کی صحیح سمت بتادے، تو اسی وقت اس کو صحیح سمت کی طرف پھر جانا چاہئے (ہدایہ باب شروط الصلوٰۃ

اللتی تتقدمہا)

ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر غیر مصلّی کے ذریعے سے بھی مقتدیوں کو امام کے رکوع و سجود اور قیام و قعود کی اطلاع پہنچے، اور وہ ذریعہ قابلِ اعتماد ہو تو اس کے مطابق حرکت کرنے سے نماز میں کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی۔ قاطعِ صلوٰۃ جو چیز ہے وہ دراصل اس نوعیت کا فعل ہے جس میں آپ کو مشغول دیکھ کر ناواقف آدمی یہ گمان کرے کہ آپ نماز نہیں پڑھ رہے ہیں۔ یا پھر مصلّی اور غیر مصلّی کے درمیان ایسا معاملہ ہو جو مکالمہ اور تعلیم و تعلّم کی حد تک پہنچا ہوا ہو۔ چنانچہ مبسوط میں ہے:

کل عمل اذا نظر الیہ الناظر من بعید لایشک انہ فی غیر الصلوٰۃ فھو مفسد لصلوتہ۔ وکل عمل لو نظر الیہ الناظر فربما یشتبہ علیہ انہ فی الصلوٰۃ فذلک غیر مفسد (جلد اوّل صفحہ ۱۹۵)	ہر وہ عمل جسے دور سے دیکھ کر آدمی بلاشک یہ سمجھے کہ اس کا مرتکب نماز میں نہیں ہے، مفسدِ صلوٰۃ ہے۔ اور ہر وہ عمل جسے دیکھنے کے باوجود آدمی یہ شبہ کرسکتا ہو کہ وہ نماز میں ہے مفسد صلوٰۃ نہیں ہے۔

اور مبسوط ہی میں دوسری جگہ ہے:-

فاما غیر المقتدی اذا فتح علی المصلّی نفسد بہ صلوٰۃ المصلّی وکذلک المصلّی اذا فتح علی غیر المصلّی، لانہ تعلیم و تعلّم و القاری اذا استفتح غیرہ فکانہ یقول بعد ما قرأت ماذا فذکرنی والذی یفتح علیہ کانہ یقول بعد ما قرأت کذا فخذ منی (صفحہ ۱۹۳)	اگر غیر مقتدی (خواہ الگ نماز پڑھ رہا ہو یا نماز نہ پڑھ رہا ہو) مصلّی کو لقمہ دے تو مصلّی کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ اور اسی طرح اگر مصلّی غیر مصلّی کو لقمہ دے تب بھی نماز فاسد ہوجائے گی کیونکہ یہ تعلیم و تعلّم ہے۔ قاری جب پڑھتے پڑھتے لقمہ مانگتا ہے تو گویا وہ سامع سے کہتا ہے کہ "اس کے بعد کیا ہے؟ مجھے یاد دلاؤ"۔ اور لقمہ دینے والا گویا اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ "اس کے بعد یہ ہے۔ یہ لو"۔

(یعنی اس طرح لقمہ دینا اور لقمہ لینا کلام کی حد میں آجاتا ہے)

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے۔ حضرت رفاعہ بن رافع کو چھینک آئی اور انھوں نے زور سے کہا الحمد للہ حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ مبارکا علیہ کما یحب ربنا ویرضی۔ نماز ختم ہونے کے بعد حضور نے فرمایا "یہ کون تھا جس نے یہ فقرہ کہا تھا؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تیس سے زیادہ فرشتے اس قول کو لے جانے کے لئے ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے"۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی)۔ دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اس حال میں نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ کے کندھے پر ایک بچی (امامہ بنت ابی العاص) بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ جب رکوع میں جاتے تو اس کو اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اسے پھر کندھے پر بٹھا لیتے (بخاری ومسلم)۔ چنانچہ اسی بنا پر فقہاء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر نماز میں بچے کو اٹھائے رہے تو یہ فعل مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے (عالمگیری) نیز حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے اتنے میں ایک بچھو نے آپ کو کاٹ لیا اور اسی حالت میں آپ نے اپنی جوتی رکھ کر اس کو مار ڈالا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اقتلوا الاسودین ولو کنتم فی الصلوٰۃ یعنی بچھو اور سانپ کو مار دو خواہ تم نماز ہی میں کیوں نہ ہو (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

پس جب کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع وسجود کرنا نہ فعل کثیر ہے، نہ تعلیم وتعلم اور مکالمہ کی تعریف میں آتا ہے تو اس کے مفسدِ صلوٰۃ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور جب کہ نماز میں بہت سے ایسے افعال کو بھی جائز رکھا گیا ہے جن کا نفس نماز سے کوئی تعلق بھی نہیں، تو فقط اتنی سی بات کہ ایک آلہ کے ذریعہ سے امام کے الفاظ کی نقل سن کر آدمی رکوع یا سجدہ میں چلا جائے، کس طرح مفسدِ صلوٰۃ ہو سکتی ہے؟۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر میں نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو نہ صرف جائز بلکہ احسن سمجھتا ہوں اور میرا وجدان یہ گواہی دیتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ آلہ موجود ہوتا تو آپ یقیناً اس کو

(باقی صفحہ ۲۰۷ کے نیچے ملاحظہ ہو)

خطباتِ جمعہ

خطبۂ اُولیٰ - ۲۸ رجمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ

حمد و صلوٰۃ کے بعد :-

برادرانِ اسلام! آج کے خطبہ میں مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ جس نماز کے اس قدر فائدے میں نے کئی خطبوں میں مسلسل آپ کے سامنے بیان کئے ہیں وہ اب کیوں وہ فائدے نہیں دے رہی ہے؟ کیا بات ہے کہ آپ نمازیں پڑھتے ہیں اور پھر بھی غلام ہیں؟ پھر بھی کفار آپ پر غالب ہیں؟ پھر بھی آپ دنیا میں تباہ حال اور نکبت زدہ ہیں؟ -

اس سوال کا مختصر جواب تو صرف یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نمازیں پڑھتے ہی نہیں، اور پڑھتے بھی ہیں تو اس طریقہ سے نہیں پڑھتے جو خدا اور رسول نے بتایا ہے، اس لئے ان فائدوں کی توقع آپ نہیں کر سکتے جو مومنین کو معراجِ کمال تک پہنچانے والی نماز سے پہنچنے چاہئیں ــــ لیکن میں جانتا ہوں کہ صرف اتنا سا جواب آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا، اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو یہ بات سمجھاؤں گا۔

یہ گھنٹا جو آپ کے سامنے لٹک رہا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں بہت سے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ

نماز اور اذان اور خطبہ میں استعمال فرماتے، جس طرح آپ نے غزوۂ خندق میں خندق کھودنے کا ایرانی طریقہ بلا تامل اختیار فرمایا۔" تاہم اگر کوئی عالمِ دین میری اس رائے کو دلائل شرعیہ سے (نہ کہ غیر مقلدیت کے طعنوں سے) غلط ثابت فرما دیں تو مجھے اس سے رجوع کرنے میں بھی تامل نہ ہوگا۔ ان اظن الا ظنا وما انا بمستیقن و انما انا بشر اخطی واصیب فانظروا فی رأیی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوا بہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ۔

جڑے ہوئے ہیں۔ جب اس کو کوک دی جاتی ہے تو سب پرزے اپنا اپنا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور ان کے حرکت کرنے کے ساتھ ہی باہر کے سفید تختے پر ان کی حرکت کا نتیجہ ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے یعنی گھنٹے کی دونوں سوئیاں چل کر ایک ایک سکنڈ اور ایک ایک منٹ بتانے لگتی ہیں۔ اب آپ ذرا غور کی نگاہ سے دیکھیے۔ گھنٹے کے بنانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ صحیح وقت بتائے۔ اس مقصد کے لئے گھنٹے کی مشین میں وہ سب پرزے جمع کیے گئے جو صحیح وقت بتانے کے لئے ضروری تھے، پھر ان سب کو اس طرح جوڑا گیا کہ سب مل کر باقاعدہ حرکت کریں اور ہر پرزہ وہی کام اور اتنا ہی کام کرتا چلا جائے جتنا صحیح وقت بتانے کے لئے اس کو کرنا چاہئے، پھر کوک دینے کا قاعدہ مقرر کیا گیا تاکہ ان پرزوں کو ٹھیرنے نہ دیا جائے اور تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ان کو حرکت دی جاتی رہے۔ اس طرح جب تمام پرزوں کو ٹھیک ٹھیک جوڑا گیا اور ان کو کوک دی گئی تب کہیں یہ گھنٹا اس قابل ہوا کہ وہ مقصد پورا کرے جس کے لئے یہ بنایا گیا ہے۔ اگر آپ اسے کوک نہ دیں تو یہ وقت نہیں بتائے گا۔ اگر آپ کوک دیں لیکن اُس قاعدے کے مطابق نہ دیں جو کوک دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے تو یہ بند ہو جائے گا یا چلے گا بھی تو صحیح وقت نہ بتائے گا۔ اگر آپ اس کے بعض پرزے نکال ڈالیں اور پھر کوک دیں تو اس کوک سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر آپ اس کے بعض پرزوں کو نکال کر اس کی جگہ سنگر مشین کے پرزے لگا دیں اور پھر کوک دیں تو یہ نہ وقت بتائے گا اور نہ کپڑا ہی سیئے گا۔ اگر آپ اس کے سارے پرزے اس کے اندر بدستور رہنے دیں لیکن ان کو کھول کر ایک دوسرے سے الگ کر دیں تو کوک دینے سے کوئی پرزا بھی حرکت نہ کرے گا۔ کہنے کو سارے پرزے اس کے اندر موجود ہوں گے، مگر محض پرزوں کے موجود رہنے سے وہ مقصد حاصل نہ ہوگا جس کے لئے گھنٹہ بنایا گیا ہے، کیونکہ ان کی ترتیب اور ان کا آپس کا تعلق آپ نے توڑ دیا ہے جس کی وجہ سے وہ مل کر حرکت نہیں کر سکتے۔ یہ سب صورتیں جو میں نے آپ سے بیان کی ہیں، ان میں اگرچہ گھنٹے کی ہستی اور اس میں کوک دینے کا فعل، دونوں بے کار ہو جاتے ہیں، لیکن دور سے دیکھنے والا یہ نہیں

کہہ سکتا کہ یہ گھنٹا نہیں ہے، یا آپ کوک نہیں دے رہے ہیں۔ وہ تو یہی کہے گا کہ صورت بالکل گھنٹے جیسی ہے، اور یہی امید کرے گا کہ گھنٹے کا جو فائدہ ہے وہ اس سے حاصل ہونا چاہئے۔ اسی طرح دور سے جب وہ آپ کو کوک دیتے ہوئے دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ آپ واقعی کوک دے رہے ہیں، اور یہی توقع کرے گا کہ گھنٹے کو کوک دینے کا جو نتیجہ ہے وہ ظاہر ہونا چاہئے۔ لیکن یہ توقع پوری کیسے ہو سکتی ہے جب کہ یہ گھنٹہ بس دور سے دیکھنے ہی کا گھنٹہ ہے، ورنہ اس کے اندر گھنٹہ پن باقی نہیں رہا۔

یہ مثال جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے اس سے آپ سارا معاملہ سمجھ سکتے ہیں۔ اسلام کو اسی گھنٹہ پر قیاس کر لیجئے۔ جس طرح گھنٹے کا مقصد صحیح وقت بتانا ہے، اسی طرح اسلام کا مقصد یہ ہے کہ زمین میں آپ خدا کے خلیفہ یعنی خدائی فوجدار بن کر رہیں، خود خدا کے حکم پر چلیں، سب پر خدا کا حکم چلائیں، اور سب کو خدا کے قانون کا تابع بنا کر رکھیں۔ اس مقصد کو صاف طور پر قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے تاکہ تم سب انسانوں کو نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان رکھو۔

اور

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ	لوگوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ غیر اللہ کی فرمانبرداری کا فتنہ مٹ جائے اور اطاعت سب کی سب صرف اللہ کے لئے ہو۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے گھنٹے کے پرزوں کی طرح اسلام میں بھی تمام وہ پرزے جمع کئے گئے ہیں جو اس غرض کے لئے ضروری اور مناسب تھے۔ دین کے عقائد، اخلاق کے اصول، معاملات کے قاعدے، خدا کے حقوق، بندوں کے حقوق، خود اپنے نفس کے حقوق، دنیا کی ہر اس چیز کے حقوق جس سے آپ کو

واسطہ پیش آتا ہے، کمانے کے قاعدے اور خرچ کرنے کے طریقے، جنگ کے قانون اور صلح کے قاعدے، حکومت کرنے کے قوانین، اور حکومتِ اسلامی کی اطاعت کرنے کے ڈھنگ۔ یہ سب اسلام کے پرزے ہیں، اور ان کو گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک ایسی ترتیب سے ایک دوسرے کے ساتھ کسا گیا ہے کہ جوں ہی اس میں کوک دی جائے، ہر پرزا دوسرے پرزوں کے ساتھ مل کر حرکت کرنے لگے۔ اور ان سب کی حرکت سے اصل نتیجہ یعنی اسلام کا غلبہ اور دنیا پر خدائی قانون کا تسلط اس طرح مسلسل ظاہر ہونا شروع ہو جائے جس طرح اس گھنٹے کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے پرزوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ باہر کے سفید تختے پر نتیجہ برابر ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے۔ گھڑی میں پرزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے رکھنے اور ان کی ترتیب کو برقرار رکھنے کے لئے چند کیلیں اور چند پتیاں لگائی گئی ہیں۔ اسی طرح اسلام کے تمام پرزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا رکھنے اور ان کی صحیح ترتیب قائم رکھنے کے لئے وہ چیز رکھی گئی ہے جس کو نظامِ جماعت کہا جاتا ہے، یعنی مسلمانوں کا ایک سردار ہو، قوم کے دماغ مل کر اس کی مدد کریں، قوم کے ہاتھ پاؤں اس کی اطاعت کریں، ان سب کی طاقت سے وہ اسلام کے قوانین نافذ کرے اور لوگوں کو ان قوانین کی خلاف ورزی سے روکے۔ اس طریقے سے جب سارے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جائیں اور ان کی ترتیب ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے تو ان کو حرکت دینے اور دیتے رہنے کے لئے کوک کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہی کوک یہ نماز ہے جو ہر روز پانچ وقت پڑھی جاتی ہے۔ پھر اس گھڑی کو صاف کرتے رہنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ صفائی یہ روزے ہیں جو سال بھر میں تیس دن تک رکھے جاتے ہیں۔ اور اس گھڑی کو تیل دیتے رہنے کی بھی ضرورت ہے، سو زکوٰۃ وہ تیل ہے جو سال بھر میں ایک مرتبہ اس کے پرزوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ تیل کہیں باہر سے نہیں آتا بلکہ اسی گھڑی کے بعض پرزے تیل بناتے ہیں اور بعض سوکھے ہوئے پرزوں کو روغن دار کر کے آسانی کے ساتھ چلنے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ پھر اسے کبھی کبھی اُوورہال کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، سو وہ اُوورہالنگ

یہ حج ہے جو عمر میں ایک مرتبہ کرنا ضروری ہے اور اس سے زیادہ جتنا کیا جا سکے اتنا ہی بہتر ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ کوک دینا اور صفائی کرنا اور تیل دینا اور اُوور ہال کرنا اسی وقت تو مفید ہو سکتا ہے جب اس فریم میں اسی گھڑی کے سارے پرزے موجود ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ اسی ترتیب سے جڑے ہوئے ہوں جس سے گھڑی ساز نے انہیں جوڑا تھا، اور ایسے تیار رہیں کہ کوک دیتے ہی اپنی مقررہ حرکت کرنے لگیں اور حرکت کرتے ہی نتیجہ دکھانے لگیں۔ لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ دوسرا ہو گیا ہے۔ اول تو وہ نظامِ جماعت ہی باقی نہیں رہا جس سے اس گھڑی کے پرزوں کو باندھا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے پینچ ڈھیلے ہو گئے اور پرزہ پرزہ الگ ہو کر بکھر گیا۔ اب جو جس کے جی میں آتا ہے کرتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ ہر شخص مختار ہے۔ اُس کا دل چاہے تو اسلام کے قانون کی پیروی کرے، اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ اس پر بھی آپ لوگوں کا دل ٹھنڈا نہ ہوا تو آپ نے اس گھڑی کے بہت سے پرزے نکال ڈالے، اور ان کی جگہ ہر شخص نے اپنی اپنی پسند کے مطابق جس دوسری مشین کا پرزا چاہا لا کر اس میں فٹ کر دیا۔ کوئی صاحب سنگر مشین کا پُرزا پسند کر کے لے آئے، کسی صاحب کو آٹا پیسنے کی چکّی کا کوئی پرزا پسند آگیا تو وہ اسے اٹھا لائے اور کسی حضرت نے موٹر لاری کی کوئی چیز پسند کی تو اسے لا کر گھڑی میں لگا دیا۔ اب آپ مسلمان بھی ہیں اور بنیک سے سودی کاروبار بھی ہے، انشورنس کمپنی میں بیمہ بھی کرا رکھا ہے، انگریزی عدالتوں میں جھوٹے مقدمے بھی لڑ رہے ہیں، سرکار برطانیہ کی وفادارانہ خدمت بھی ہو رہی ہے، بیٹیوں اور بہنوں اور بیویوں کو میم صاحب بھی بنایا جا رہا ہے، گاندھی صاحب کی پیروی بھی ہو رہی ہے، اور لینن صاحب کے راگ بھی گائے جا رہے ہیں غرض کوئی غیر اسلامی چیز ایسی نہیں رہی جسے ہمارے بھائی مسلمانوں نے لا لا کر اسلام کی اس گھڑی کے فریم میں ٹھونس نہ دیا ہو۔

یہ سب حرکتیں کرنے کے بعد اب آپ چاہتے ہیں کہ کوک دینے سے یہ گھڑی چلے اور وہی نتیجہ دکھائے جس کے لئے اس گھڑی کو بنایا گیا تھا، اور صفائی کرنے، تیل دینے اور اُوور ہال کرنے سے

وہی فائدے ہوں جو ان کاموں کے لئے مقرر ہیں۔ مگر ذرا عقل سے آپ کام لیں تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ جو حال آپ نے اس گھڑی کا کر دیا ہے اس میں عمر بھر کوک دینے اور صفائی کرنے اور تیل دیتے رہنے سے بھی کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ جب تک کہ آپ باہر سے آئے ہوئے تمام پرزوں کو نکال کر اس کے اصلی پرزے اس میں نہ رکھیں گے، اور پھر ان پرزوں کو اسی ترتیب کے ساتھ جوڑ کر کس نہ دیں گے جس طرح ابتدا میں انہیں جوڑا اور کسا گیا تھا، آپ ہرگز ان نتائج کی توقع نہیں کر سکتے جو اس سے کبھی ظاہر ہوئے تھے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ یہ اصلی وجہ ہے آپ کی نمازوں اور زکوٰۃ و حج کے بے نتیجہ ہو جانے کی۔ اوّل تو آپ میں سے نمازیں پڑھنے والے اور روزے رکھنے والے اور زکوٰۃ و حج ادا کرنے والے ہی کتنے ہیں۔ نظامِ جماعت کے بکھر جانے سے ہر شخص مختارِ مطلق ہو گیا ہے۔ چاہے ان فرائض کو ادا کرے، چاہے نہ کرے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ پھر جو لوگ انہیں ادا کرتے ہیں وہ بھی کس طرح کرتے ہیں؟ نمازیں جماعت کی پابندی نہیں، اور اگر کہیں جماعت کی پابندی ہے بھی تو مسجدوں کی امامت کے لئے ان لوگوں کو چنا جاتا ہے جو دنیا میں کسی اور کام کے قابل نہیں ہوتے۔ مسجد کی روٹیاں کھانے والے، فرضِ دینی کو کمائی کا ذریعہ سمجھنے والے، جاہل، کم حوصلہ اور پست اخلاق لوگوں کو آپ نے اس نماز کا امام بنایا ہے جو آپ کو خدا کا خلیفہ اور دنیا میں خدائی فوجدار بنانے کیلئے مقرر کی گئی تھی۔ اسی طرح روزے اور زکوٰۃ اور حج کا جو حال ہے وہ بھی ناقابلِ بیان ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب بھی بہت سے مسلمان اپنے فرائضِ دینی بجا لانے والے ضرور ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں گھڑی کا پرزا پرزا الگ کر کے اور اس میں بیسیوں اجنبی چیزیں داخل کر کے آپ کا کوک دینا اور نہ دینا، صفائی کرنا اور نہ کرنا، تیل دینا اور نہ دینا، دونوں بے نتیجہ ہیں۔ آپ کی یہ گھڑی دور سے گھڑی ہی نظر آتی ہے۔ دیکھنے والا

یہی کہتا ہے کہ یہ اسلام ہے اور آپ مسلمان ہیں۔ آپ جب اس گھڑی کو کوک دیتے اور صفائی کرتے ہیں تو دور سے دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ واقعی آپ کوک دے رہے ہیں اور صفائی کر رہے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نماز، نماز نہیں ہے، یا یہ روزے، روزے نہیں ہیں۔ مگر دیکھنے والوں کو کیا خبر کہ اس ظاہری فریم کے اندر کیا کچھ کارستانیاں کی گئی ہیں۔

خطبۂ ثانیہ الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

برادرانِ اسلام! میں نے آپ کو اصلی وجہ بتا دی ہے کہ آپ کے یہ مذہبی اعمال آج کیوں بے نتیجہ ہو رہے ہیں، اور کیا وجہ ہے کہ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے کے باوجود آپ خدائی فوجدار بننے کے بجائے کفار کے قیدی اور ہر ظالم کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کو اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات بتاؤں۔ آپ کو اپنی اس حالت کا رنج اور اپنی مصیبت کا احساس ضرور ہے، مگر آپ کے اندر ہزار میں نوسو ننانوے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ ایسے ہیں جو اس حالت کو بدلنے کی صحیح صورت کے لئے راضی نہیں ہیں۔ وہ اسلام کے اس گھنٹے کو جس کا پرزا پرزا اندر سے الگ کر دیا گیا ہے اور جس میں اپنی اپنی پسند کے مطابق ہر شخص نے کوئی نہ کوئی چیز ملا رکھی ہے، از سرِ نو مرتب کرنا برداشت نہیں کر سکتے، کیونکہ جب اس میں سے بیرونی چیزیں نکالی جائیں گی تو ان کی پسند کی بھی کچھ چیزیں نکل کر رہیں گی، اور جب اس کو کسا جائے گا تو وہ خود بھی اس کے ساتھ کسے جائیں گے۔ اور یہ ایسی مشقت ہے جسے برضا و رغبت گوارا کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔ اس لئے بس وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ گھنٹہ اسی حال میں دیوار کی زینت بنا رہے اور دور سے لا لا کر لوگوں کو اس کی زیارت کرائی جائے، اور انہیں بتایا جائے کہ اس گھنٹے میں ایسی اور ایسی کرامات چھپی ہوئی ہیں۔ ان سے بڑھ کر جو لوگ کچھ زیادہ اس گھنٹے کے ہوا خواہ ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اسی حالت میں اس کو خوب دل لگا لگا کر کوک دی جائے

اور نہایت تندہی کے ساتھ اس کی صفائی کی جائے، مگر جانشا کہ اس کے پرزوں کو مرتب کرنے اور کسنے اور بیرونی پرزے نکال پھینکنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔

کاش میں آپ کی ہاں میں ہاں ملا سکتا۔ مگر کیا کروں کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اس کے خلاف نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس حالت میں آپ اس وقت ہیں اس میں پانچ وقت کی نمازوں کے ساتھ تہجد اور اشراق اور چاشت بھی آپ پڑھنے لگیں، اور پانچ پانچ گھنٹے روزانہ بھی قرآن پڑھیں، اور رمضان شریف کے علاوہ گیارہ مہینوں میں ساڑھے پانچ مہینوں کے مزید روزے بھی رکھ لیا کریں تب بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ گھڑی کے اندر اس کے اصلی پرزے رکھے ہوں اور انہیں کس دیا جائے تب تو ذراسی کوک بھی اس کو چلا دے گی، تھوڑا سا صاف کرنا اور ذرا سا تیل دینا بھی نتیجہ خیز ہوگا۔ ورنہ عمر بھر کوک دیتے رہئیے، گھڑی نہ چلنی ہے نہ چلے گی۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ۔

درود و سلام و دعا

اشاعت خاص ترجمان القرآن

رجب ۵۷ھ کی اشاعت ترجمان القرآن کی اشاعت خاص ہوگی جس میں شعبان ۵۵ھ سے آج تک کے تمام "اشارات" یکجا شائع کیے جائیں گے۔ ان مضامین کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے، اور بہت سے اہم مباحث کا اضافہ کر دیا گیا ہے ضمیمہ کے طور پر جناب ابو رہان کا مضمون "متاع کارواں" بھی اس کے ساتھ ہوگا۔

پچھلے مضامین کا مجموعہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے نام سے شائع ہوا تھا، آٹھ ہزار کی تعداد میں طبع کیا گیا تھا اور قریب قریب سب نکل گیا۔ اس مقبولیت کو دیکھ کر یہ دوسرا مجموعہ سات ہزار کی تعداد میں طبع کیا جا رہا ہے ضخامت تقریباً ۲۴۰ صفحہ ہوگی۔ قیمت فی نسخہ ۵/ ایک روپیہ میں ۴ نسخے ۲۰ روپیے میں سو نسخے علاوہ محصول ڈاک۔

جو حضرات اس کی اشاعت میں حصہ لینا چاہتے ہوں وہ مہتمم شعبہ اشاعت دارالاسلام کے پاس فرمائش بھیجیں۔

مطبوعات

یادگارِ سلف — تالیف مولٰنا نجم الدین صاحب اصلاحی، ضخامت ۲۷۶ صفحات، قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ۔

حضرت مولانا سید محمد امین الحسنی الحسینی ضلع رائے بریلی میں ایک صاحب سلسلہ و ارشاد بزرگ گذرے ہیں جن کا خاندانی رشتہ حضرت سید احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ سے ملتا ہے۔ رسوخ علم، صلاح عمل، اتباع سنت اور امر بالمعروف میں اس چودھویں صدی کے اندر "سلف" کی "یادگار" تھے۔ یہ کتاب انہیں کے حالات پر مشتمل ہے، جسے مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی نے نہایت بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ ابتدا میں مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مختصر مقدمہ ہے، جس سے سوانح کی قیمت اور صاحب سوانح کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ کتاب محض عام حالاتِ زندگی کا سرسری خاکہ ہی نہیں ہے بلکہ اپنی علمی افادیت کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔ جہاں ایک سچے اور مجاہد انسان کی سیرت سے ایمانی حرارت حاصل کی جاسکتی ہے وہاں بیعت، نسبت، وجد، تصوف اور امر بالمعروف وغیرہ عنوانات سے حقائق افروز علمی بحثیں بھی موجود ہیں۔ تصوف کی یہ حقیقت کہ وہ دراصل احسان و تقویٰ اور اتباع کتاب و سنت کا دوسرا نام ہے لیکن آج چنگ و رباب کے نغموں اور عرس و قبر پرستی کے ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی ہے، پوری طرح بے نقاب کر کے دکھائی گئی ہے، طرزِ تحریر عموماً سنجیدہ ہے، کتاب اپنی ظاہری و معنوی دونوں حیثیت سے قابل دید ہے، عام علم دوست حضرات خصوصاً مولانا مرحوم کے معتقدین کے دیکھنے کی چیز ہے۔

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے ہے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۵ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں رُوحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصُول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصُول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حِصّہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دُوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد ۴؎

رسالۂ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا بہت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عمُوماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصُولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوہنی و تصاویر پرنٹنگ پریس لاہور میں طبع ہوئے